مطالعہ علوم اسلامیہ

اردو ترجمہ

كتاب الزكاة

من الهداية

تصدرها:

المكتبة العلمية

للطباعة والنشر والتوزيع

١٥- لیک روڈ، لاہور

مغرب پاکستان

مطالعہ علوم اسلامیہ

کتاب الزکوٰۃ

من الھدایہ

پروفیسر غازی احمد

ایم اے (عربی، گولڈ میڈلسٹ)

ایم اے (علوم اسلامیہ گولڈ میڈلسٹ)

ایم۔ او۔ ایل۔ بی۔ ایڈ

مولوی فاضل (میڈلسٹ)

منشی فاضل۔ فاضل درس نظامی

تجدید نظر

عبید الحق ندوی

المکتبۃ العلمیۃ

۱۵ لیک روڈ ○ لاہور پاکستان

فهرست مضامين

(كتاب الزكاة)

نمبر شمار	عنوان	صفحه
١-	كتاب الزكاة	١
٢-	باب صدقة السوائم	١٩
٣-	فصل فى البقر	٢٣
٤-	فصل فى الغَنَم	٢٨
٥-	فصل فى الخيل	٣١
٦-	فصل	٣٣
٧-	باب زكاة المال (فصل فى الفضة)	٥١
٨-	فصل فى الذهب	٥٦
٩-	فصل فى العروض	٥٩
١٠-	باب من يمر على العاشر	٦٣
١١-	باب فى المعادن والركاز	٧٨
١٢-	باب زكاة الزروع والثمار	٨٦
١٣-	باب من يجوز دفع الصدقات ومن لا يجوز	١٠٢
١٤-	باب صدقة الفطر	١٢٠
١٥-	فصل فى مقدار الواجب ووقته	١٢٨

كتابُ الزّكاة

زکاۃ کا بیان

مسئلہ : زکاۃ آزاد ، عاقل اور بالغ مسلمان شخص پر واجب ہے . جب کہ وہ پورے طور پر نصاب کا مالک (اور صاحب تصرّف) ہو اور اس (نصاب) پر ایک سال گزر جائے . وجوب زکاۃ کے دلائل سہ گونہ ہیں :

۱۔ فرمان باری تعالی : "وآتوا الزکاۃ" اور زکاۃ دیتے رہو (اس سے وجوب کا ثبوت ہوتا ہے) .

۲۔ ارشاد نبوی ﷺ "أدوا زکاۃ أموالکم" اپنے اموال کی زکاۃ ادا کرو (بھی اس کا حامل ہے) .

۳۔ زکاۃ کے وجوب پر تمام اُمت محمدیہ رض کا اجماع ہے .

سوال ۔ اصول فقہ کا مسلمہ قانون ہے کہ :

(أ) دلیل قطعی الثبوت و قطعی الدلالۃ سے فرضیۃ ،

(ب) دلیل ظنی الثبوت و ظنی الدلالۃ سے سنیۃ ،

(ج) اور دلیل قطعی الثبوت وظنی الدلالۃ یا ظنی الثبوت

و قطعی الدلالة سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ ارشاد باری ”وآتوا الزکاة“ قطعی الثبوت وقطعی الدلالة ہے جس سے فرضیت کا پتا چلتا ہے۔ مگر مصنفؒ نے الزکاة واجبة کیوں کہا ؟ شارحؒ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ) یہاں لفظ واجب سے مراد اصطلاحی واجب نہیں بلکہ) فرض ہے کیونکہ فرضیة زکاة شک و شبہ سے بالا تر ہے۔

حریت کی شرط اس لیے عائد کی گئی کہ ملکیة و تصرف کا کمال حریت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ (غلام کو مال میں کمال ملکیة حاصل نہیں ہوتا ، بلکہ وہ مالک کے احکام کا پابند ہوتا ہے)۔

عقل اور بلوغ کی شرط کے متعلق آگے بحث آ رہی ہے (یعنی صبی اور مجنون کے ضمن میں)۔ اسلام کی شرط اس لیے ضروری ہے کہ زکاة عبادة کا درجہ رکھتی ہے اور کافر سے عبادة کا تحقق ممکن نہیں۔

وجوب زکاة کی پانچویں شرط نصاب ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے نصاب ہی کو فرضیة زکاة کا سبب قرار دیا ہے۔ (بخاری اور مسلم میں ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا : کھجور کے پانچ وسق سے کم میں ، چاندی کے پانچ اوقیہ سے کم میں اور پانچ اونٹوں سے کم میں زکاة نہیں ہے)۔

سال کا پورا ہونا اس لیے شرط قرار دیا گیا کہ مال کی نشو و نما کے لیے آخر کسی نہ کسی مدت کا تعین ضروری

تھا . شریعۃ نے ایک سال کا عرصہ مقرر کر دیا . نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تک مال پر ایک سال نہ گزر جائے زکاۃ واجب نہیں ہوتی .

دوسری بات یہ ہے کہ سال کا عرصہ انسان کو مال کی نشو و نما اور اضافے پر قادر کر دیتا ہے (لأنه الممكن به من الإستنماء میں با زائدہ ہے اور من بمعنی علی ہے) . (کیونکہ سال مختلف فصلوں پر مشتمل ہوتا ہے . (اور انسان ان فصول یعنی ربیع ، خریف ، گرما ، سرما وغیرہ میں اپنا روپیہ تجارت میں لگا کر معقول نفع حاصل کرکے اصل مال میں اضافہ کر سکتا ہے) اور عموماً (سال کے دوران) اشیاء کے بھاؤ میں بھی اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے . لہٰذا (اضافے کے) حکم کا دار و مدار سال ہی پر رکھا گیا . (یعنی اگر رقم وغیرہ پر ایک سال گزر جائے تو زکاۃ واجب ہوگی ، خواہ مال کو تجارت وغیرہ میں لگائے یا نہ لگائے) .

مسئلہ : امام کرخیؒ فرماتے ہیں کہ (زکاۃ کی) ادائیگی فوری طور پر واجب ہوگی (لہٰذا سال گزرتے ہی فوراً ادا کر دی جائے) کیونکہ ارشاد باری تعالی "وآتوا الزكاة" میں "آتوا" امر مطلق ہے . (جس کے ساتھ کوئی قید نہیں اور امر مطلق فوری ادائیگی کا مقتضی ہوتا ہے) .

امام ابوبکر الجصاص الرازیؒ فرماتے ہیں کہ واجب علی التراخی ہے (یعنی زکاۃ سال گزرنے کے بعد دیر سے بھی ادا کی جا سکتی ہے) . کیونکہ تمام عمر ادا کا وقت ہے .

اسی وجہ سے ادائیگی میں کوتاہی اور تاخیر کی بناء پر ــــ اگر نصاب ضائع ہو جائے ــــ (تو زکاۃ) اس کے ذمہ نہیں رہتی ۔

(مسئلے کی صورۃ یہ ہے مثلاً ایک شخص کے مال پر ماہ رمضان میں سال پورا ہو جاتا ہے اور یکم رمضان سے زکاۃ واجب ہو جاتی ہے ، مگر اس نے فوری طور پر زکاۃ ادا نہ کی حتی کہ ذی الحجہ میں تمام مال جاتا رہا ۔ تو اب اس سے گزشتہ سال کی زکاۃ ساقط ہو جائے گی ۔ اگر فوری طور پر واجب ہوتی تو ساقط نہ ہوتی) ۔

امام مالکؒ ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ مذکورہ صورۃ میں وجوب زکاۃ کے قائل ہیں ۔ اگر کوئی شخص عمداً نصاب ضائع کر دے تو سب کے نزدیک اس پر زکاۃ واجب ہوگی) ۔

مسئلہ : بچے اور دیوانے پر زکاۃ واجب نہیں ۔ امام شافعیؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ زکاۃ ایک مالی تاوان ہے ۔ لہذا اسے دوسرے مالی احکام مثلاً بیویوں کے خرچ ، عُشر، خراج وغیرہ پر قیاس کیا جائے گا ۔ (یعنی اگر کسی بچے یا مجنون کا نکاح کر دیا جائے تو بیوی کے اخراجات ان کے مال سے ادا کیے جائیں گے ۔ اسی طرح اگر بچے یا مجنون کی ملکیۃ میں عُشری یا خراجی زمین ہو تو اس کی پیداوار سے عُشر یا خراج بھی ادا کیا جائے گا ۔ لہذا زکاۃ کا بھی یہی حکم ہوگا ۔ کیونکہ یہ بھی ایک مالی معاملہ ہے) ۔

عُشر سے مراد وہ مالیہ ہے جو مسلمان اپنی زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار سے دسواں حصہ ادا کرتے ہیں۔ اگر زمین چاہی یا نہری ہو تو بیسواں حصہ ادا کیا جاتا ہے۔

خراج سے مراد وہ لگان ہے جو کفار سے ان کی اراضی سے حاصل شدہ پیداوار پر وصول کیا جاتا ہے۔ اگر کسی غیر مسلم سے کوئی مسلمان خراجی زمین خرید لے تو مسلمان کو عُشر نہیں بلکہ خراج ہی ادا کرنا پڑے گا)۔

علمائے احنافؒ امام شافعیؒ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ زکاۃ عبادۃ ہے اور عبادۃ کی صحت کا دار و مدار اختیار و رضاء پر ہے۔ جس سے ابتلاء اور آزمائش کا تحقق ہوتا ہے۔ مگر بچے اور مجنون میں اختیار ہی کہاں ؟ کیونکہ وہ تو عقل سے عاری ہیں۔ (یعنی عبادۃ کا انحصار انسان کے اختیار و رضاء پر ہے۔ مگر بچہ اور مجنون فقدان عقل کی بناء پر احکام شرع کے مکلف ہی نہیں۔ اس لیے ان پر عبادۃ کی فرضیۃ ہی ثابت نہیں ہوتی۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ اگر کسی سے جبراً نماز پڑھوائی جائے تو یہ نماز عبادۃ کے معیار پر پوری نہیں اترے گی۔ کیونکہ اس میں اختیار و رضاء کا عنصر مفقود ہے)۔ اس مسئلے کو خراج پر قیاس کرنا درست نہیں۔ کیونکہ خراج تو زمین کا تاوان ہے (عبادۃ کا پہلو خراج میں قطعاً معدوم ہے۔ اگر خراج ادا نہ کیا جائے تو زمین کے ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔

عُشر کی بھی یہی کیفیۃ ہے کہ اس میں مالی مشقۃ کی

حیثیت نمایاں ہے اور عبادۃ کا پہلو ثانوی درجے کا حامل ہے (یعنی خراج کی طرح عشر میں بھی مالی مشقت اولین اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اگر مسلمان بھی عشر سے بالکل انکار کر دے تو زمین کے ضیاع اور قید و بند کا خطرہ در پیش ہے۔ عبادۃ کا پہلو ـــ کہ عشر سے فقراء و مساکین کی حاجت روائی ہوتی ہے ـــ تابع اور ثانوی حیثیت رکھتا ہے)

مسئلہ: اگر سال کے کسی حصے میں مجنون کو افاقہ ہوگیا (یعنی ہوش و حواس درست ہوگئے) تو اس کے لیے وہی احکام ہوں گے جو ماہ رمضان میں اس کے لیے ہیں۔ (اگر مجنون شخص کو ماہ رمضان میں کسی دن افاقہ ہو جائے اور اس کے ہوش و حواس بجا ہو جائیں تو اس پر پورے رمضان کی قضا واجب ہوگی۔ اسی طرح اگر مجنون کو مالک نصابہ ہونے کے بعد سال کے دوران افاقہ ہوگیا تو زکاۃ واجب ہوگی۔ اگر سارا سال جنون طاری رہا تو زکاۃ ساقط ہو جائے گی)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ سال کے اکثر حصہ کے پیش نظر احکام کا اجراء ہوگا۔ (اگر سال کا اکثر حصہ بیمار رہا تو زکاۃ ساقط ہوگی اور اگر اکثر حصہ صحت میں گزارا تو واجب ہوگی)۔

جنون اصلی اور عارضی میں کوئی فرق نہیں۔ (یعنی مذکورہ احکام ہی جاری ہوں گے۔ أی إذا أفاق فی بعض السنة یجب علیه الزکاة۔

جنون اصلی سے مراد یہ ہے کہ بالغ ہونے سے پہلے ہی مرض جنون میں مبتلا ہو جائے۔ اگر بلوغت کے بعد جنون لاحق ہو تو یہ جنون عارضی کہلاتا ہے)۔

امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ مجنون جب حالت جنون ہی میں سن بلوغ تک پہنچے تو ہوش مند ہونے کے وقت سے سال شمار کیا جائے گا۔ (یعنی ہوش میں آنے کے دن سے ایک سال بعد زکاۃ واجب ہوگی) کیونکہ مجنون بالغ ہونے والے بچے کی مانند ہے۔ (یعنی جس طرح بچے کی بلوغت کے دن سے سال کا حساب لگایا جاتا ہے، اسی طرح مجنون کے صحت مند ہونے کے دن سے سال شمار کیا جائے گا)۔

مسئلہ: مکاتب پر زکاۃ واجب نہیں کیونکہ وہ ملکیۃ کی منافی شے یعنی غلامی کے موجود ہونے کی بناء پر من کل الوجوہ مالک نہیں ہوتا۔ اسی لیے مکاتب اس بات کا بھی اہل نہیں ہوتا کہ غلام کو آزاد کر سکے۔ (مکاتب تو معاہدے کی پوری رقم ادا کرنے پر ہی وصف حریت سے موصوف ہو سکتا ہے)۔

(مکاتب اور عام غلام میں فرق یہ ہے کہ مکاتب کی کمائی اس کی اپنی کمائی ہوتی ہے اور غلام کی کمائی کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے۔ نیز مکاتب کو فروخت نہیں کیا جا سکتا، لیکن عام غلام کو فروخت کیا جا سکتا ہے)۔

مسئلہ: جو شخص اپنے مال کی قیمت سے زیادہ کا مقروض ہو اس پر زکاۃ واجب نہ ہوگی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں : واجب ہوگی کیونکہ (وجوب زکاۃ یعنی) پورے نصاب شرعی کے مالک ہونے کا سبب موجود ہے۔

احنافؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس کا یہ مال (جو قرض کی رقم جتنا ہے یا کم) دراصل اس کی حوائج اصلیہ یعنی (بنیادی) ضروریات زندگی میں رکا ہوا ہے ، لہذا اسے نہ ہونے کے مترادف تصور کیا جائے گا۔ جیسا کہ وہ پانی جو پینے کے لیے مخصوص ہو یا وہ کپڑے جو استعمال کے لیے یا کسی خاص وقت کے پہننے کے لیے رکھے ہوں۔ (اگر کسی کارواں میں بعض مسافر جا رہے ہوں اور انہوں نے زاد راہ کے طور پر پینے کے لیے پانی مخصوص کر رکھا ہو اور نماز کا وقت آنے پر مسافروں کو وضو کی ضرورت ہو ، تو پانی کم ہونے کی صورۃ میں مسافر کو اجازۃ ہے کہ وضو کی بجائے تیمم کر لے۔

ایسے ہی اگر کسی کے پاس استعمال کے لیے ایک سے زائد جوڑے ہوں ، لیکن چونکہ وہ پہننے کے لیے ہیں فروخت کرنے کے لیے نہیں۔ اس لیے وہ ضرورۃ سے زائد شمار نہیں کیے جائیں گے ، اگرچہ ان کی قیمت نصاب سے زائد ہی ہو مگر زکاۃ واجب نہ ہوگی)۔

مسئلہ : اگر کسی شخص کا مال قرض سے زائد ہو تو زائد حصے کی زکاۃ دے۔ بشرطیکہ وہ (زائد مال) نصاب کو پہنچ جائے۔ کیونکہ یہ (زائد) رقم اس کی حاجۃ سے زائد

ہے۔ (مثلاً ایک شخص کے پاس ایک سو ساڑھے باون روپے ہیں اور وہ سو روپے کا مقروض ہے۔ تو اس پر باقی ماندہ ساڑھے باون روپے کی زکاۃ واجب ہوگی)۔

دین سے مراد وہ قرض ہے کہ جس کا مطالبہ کرنے والا انسانوں میں سے ہو۔ حتی کہ دین نذر اور دین کفارہ زکاۃ سے مانع نہیں ہیں (قرض کی دو قسمیں ہیں، ایک قرض وہ ہے جس کا تقاضا کرنے والے انسان ہوں۔ دوسرا قرض وہ ہے جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔ جیسے نذر، کفارہ، صدقۂ فطر، وجوب حج اور قربانی وغیرہ۔

پہلی نوع کا قرض وجوب زکاۃ سے مانع ہے۔ مگر دوسرا قرض مانع نہیں۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دو سو روپے ہیں اور اس نے نذر مان رکھی ہے کہ اگر میرا فلاں کام بخیر و خوبی تکمیل پذیر ہوگیا تو میں سو روپے فی سبیل اللہ تقسیم کروں گا، ایفاء نذر سے پہلے زکاۃ کا وقت آگیا تو اس پر دو سو روپے کی زکاۃ واجب ہوگی۔ کیونکہ یہ قرض نوع ثانی سے متعلق ہے جس کا من جہۃ العباد کوئی تقاضا کرنے والا نہیں)۔

دین زکاۃ بقاء نصاب کی حالت کو مانع ہے کیونکہ اس (دین) سے نصاب میں کمی آجاتی ہے۔ (مثلاً ایک شخص کے پاس ۲۰۰ درہم ہیں مگر گذشتہ دو سالوں کی زکاۃ ابھی تک اس نے ادا نہیں کی، تو اب تیسرے سال کی زکاۃ اس پر واجب نہ ہوگی۔ کیونکہ دو سالوں کی زکاۃ کی ادائیگی

کرنے پر ۱۹۰ درہم باقی رہتے ہیں جو نصاب سے کم ہیں) .

اور مال کے ہلاک ہونے کے بعد بھی یہی حکم جاری ہوگا . (مثلا ایک شخص کے پاس دو سو درہم تھے ، جن میں پورا سال گزر گیا ، مگر زکاۃ ادا کرنے سے پہلے ہی سارا مال ہاتھ سے جاتا رہا . بعد ازاں اس شخص نے دو سو درہم مزید جمع کر لیے جن پر سال گزر گیا تو اب ان دو سو درہم پر زکاۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ ابھی تک سابقہ دو سو درہم کی زکاۃ بطور قرض اس کے ذمہ ہے . جب وہ ادا کرے گا تو ایک سو پچانوے درہم باقی رہیں گے جو نصاب سے کم ہے) .

امام زفرؒ کو مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اختلاف ہے . (وہ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں اس پر زکاۃ واجب ہے . اگر وہ خود ادا نہ کرے تو حاکم وقت کو حق حاصل ہے کہ اس سے جبراً وصول کرے . خلیفۂ اول حضرت صدیقؓ کا کردار وصولی زکاۃ کی بین دلیل ہے . لہذا مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں زکاۃ واجب ہوگی . کیونکہ ادائیگی میں تأخیر کا ذمہ دار خود صاحب مال ہے) .

امام ابو یوسفؒ کو ــــ جیسا کہ ان سے مروی ہےـــ صرف دوسری صورۃ سے اختلاف ہے . (امام ابو یوسفؒ پہلی صورۃ یعنی دین زکاۃ میں امام ابو حنیفہؒ کے مؤید ہیں . مگر دوسری یعنی مال ضائع ہونے کی صورۃ میں وجوب زکاۃ کے قائل

ہیں ۔ کیونکہ پہلی صورۃ میں کم از کم حاکم وقت تو تقاضا کرنے والا ہے ۔ اس لیے وجوب نصاب کی زکاۃ واجب نہ ہوگی ، مگر دوسری صورۃ میں جب کہ رأس المال ہی ضائع ہوگیا تو گویا کوئی تقاضا کرنے والا ہی نہ رہا ، اس لیے موجودہ نصاب پر بھی زکاۃ واجب ہوگی) ۔

لأن له مطالباً وهو الامام الخ دونوں مسئلوں کی یہ دلیل امام اعظمؒ کی پیش کردہ ہے ۔ دونوں صورتوں میں تقاضا کرنے والا موجود ہے ۔ جانوروں میں امام مطالبہ کرنے والا ہوتا ہے اور اموال تجارت میں اس کے نائب ۔ کیونکہ جو لوگ اموال کے مالک ہوتے ہیں وہ گویا امام کی طرف سے نائب ہوتے ہیں ۔ (امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ دین زکاۃ کی صورۃ ہو یا استہلاک مال کی دونوں حالتوں میں تقاضا کرنے والا موجود ہے ۔ جانوروں میں امام مطالب ہوتا ہے اور اموال تجارت میں خود اصحاب مال مطالب ہیں ۔ کیونکہ ہر مسلمان خلیفہ وقت کا نائب ہوتا ہے اس لیے دونوں مسئلوں میں انسانوں میں سے مطالبہ کرنے والا ثابت ہوگیا ۔ لہذا مذکورہ صورتوں میں موجودہ نصاب کی زکاۃ واجب نہیں ہوگی) ۔

مسئلہ : رہائشی مکانات ، استعمال کے پارچہ جات ، گھروں کے سامان ، سواری کے جانوروں ، خدمت پر مأمور غلاموں اور استعمال کے لیے موجود اسلحہ پر زکاۃ واجب نہ ہوگی ۔ کیونکہ یہ تمام اشیاء ضروریات زندگی کی کفالۃ کے لیے

ہیں اور ان میں کوئی چیز بھی نامی (بڑھنے والا) مال نہیں ۔ اسی طرح طلبہ کی وہ کتابیں جو ان کے ذاتی مطالعہ اور استعمال کے لیے ہوں اور کاریگروں کے وہ آلات جو انھوں نے صنعت و حرفۃ کے لیے رکھے ہوں ان پر زکاۃ واجب نہ ہوگی ۔

مسئلہ : ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ قرض تھا ۔ وہ (مقروض) کئی سالوں تک قرض سے انکار کرتا رہا مگر بعد میں قرض کا ثبوت مہیا ہوگیا تو قرض خواہ پر (ان گزشتہ سالوں کی) زکاۃ واجب نہ ہوگی ۔ ثبوت مہیا ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقروض لوگوں کے سامنے (قرض کا) اقرار کرلے ۔

یہ مال ضمار کا مسئلہ ہے ۔ (مال ضمار اس مال کو کہتے ہیں جو مالک کے قبضہ و تصرف سے جاتا رہے اور اس کے حصول کی امید بھی منقطع ہو چکی ہو) ۔

اس مسئلے میں امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کو اختلاف ہے (وہ فرماتے ہیں کہ جتنا عرصہ مال مفقود الثبوت رہا ، مال کے دستیاب ہونے پر اتنے عرصہ کی زکاۃ بھی واجب ہوگی) ۔

مندرجہ ذیل اموال بھی مال ضمار میں شامل ہیں :

۱۔ مفقود مال (یعنی گم شدہ مال) ۔

۲۔ مفرور غلام ۔

۳۔ گم کردہ راہ غلام (یعنی غلام بھاگا نہیں بلکہ راستہ بھول کر مفقود الخبر ہوگیا اور کئی سالوں بعد لوٹا)

۴۔ غصب شدہ مال جس کا ثبوت موجود نہ ہو ۔

۵- دریا میں ڈوب جانے والا مال۔

۶- جو مال جنگل میں دفن کیا جائے اور متعین جگہ بھول جائے۔

۷- وہ مال یا غلام جو کوئی حاکم ظلم سے چھین لے۔

(مذکورہ تمام صورتوں میں مال یا غلام کی دستیابی پر احناف کے نزدیک گزشتہ سالوں کی زکاۃ واجب نہ ہوگی۔ امام زفرؒ و امام شافعیؒ وجوب کے قائل ہیں)۔

مفرور غلام، گم کردہ راہ غلام اور غصب شدہ غلام کے (واپس ملنے کی صورۃ میں عرصہ غیبوبۃ کے) صدقہ فطر کے وجوب میں بھی اسی طرح اختلاف موجود ہے۔ (احناف گذشتہ عرصے کا صدقۂ فطر واجب قرار نہیں دیتے۔ مگر امام زفرؒ اور امام شافعیؒ واجب گردانتے ہیں)۔

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ زکاۃ کا سبب (یعنی نصاب) موجود ہے اور مال کا (سردست) ہاتھ میں نہ ہونا وجوب زکاۃ سے مانع نہیں ہوتا، جیسا کہ مسافر کا مال ہوتا ہے۔ (یعنی مسافر کا مال بھی اس کے پاس موجود نہیں ہوتا مگر زکاۃ واجب ہوتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ صورتوں میں بھی مال دستیاب ہونے پر گذشتہ عرصے کی زکاۃ واجب ہوگی)۔

علماء احناف کا استدلال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد گرامی ہے کہ مال ضمار پر زکاۃ واجب نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وجوب زکاۃ کا سبب نامی مال ہے۔ مگر جب مال پر قدرۃ تصرف ہی نہ ہو تو نما کہاں سے آئے گا اور مذکورہ بالا تمام صورتوں میں مالک کا تصرف ممکن نہیں۔ (لہذا گزشتہ عرصے کی زکاۃ کے وجوب کا قول عقل و نقل کے خلاف ہے)۔

امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا مسافر پر قیاس کرنا درست نہیں۔ کیونکہ مسافر اپنے نائب کی وجہ سے (تصرف پر) قادر ہوتا ہے۔

مسئلہ : جو مال گھر میں مدفون ہو اسے نصاب شمار کیا جائے گا۔ (اور اس پر زکاۃ واجب ہوگی) کیونکہ اس کا وصول ہونا ممکن ہے۔

مسئلہ : جو مال باہر مملوکہ زمین میں یا باغ میں مدفون ہو۔ (اور دفن کرنے والا وہ جگہ بھول جائے) اس (کی زکاۃ) کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ (جن فقہاء کے نزدیک اس مسئلے کی نوعیت گھر میں مدفون مال کے مشابہ ہے ان کے نزدیک مال کی دستیابی پر گزشتہ عرصے کی زکاۃ واجب ہے اور جو فقہاء اسے جنگل میں مدفون مال پر قیاس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس پر زکاۃ واجب نہیں)۔

مسئلہ : اگر قرض کسی ایسے شخص پر ہو جو قرض کا اقرار کرتا ہو اور مقروض خواہ مال دار ہو یا نادار ہر دو صورۃ میں قرض دینے والے شخص پر زکاۃ واجب ہوگی۔ کیونکہ اس صورۃ میں رقم کا وصول ہونا ممکن ہے۔ مال دار

سے تو عندالطلب ہی وصول ہو سکتا ہے اور نادار سے جب اسے میسر ہو۔

اسی طرح اگر قرض کسی ایسے شخص پر ہے جو انکار کرتا ہے۔ لیکن اس پر گواہ موجود ہیں یا قاضی کو اس قرض کا علم ہے تو اس صورۃ میں بھی مسئلہ کا حکم وہی ہوگا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی زکاۃ واجب ہوگی)۔

مسئلہ : اگر قرض کسی ایسے شخص پر ہو جو قرض کا اقرار تو کرتا ہے، مگر قاضی نے اسے دیوالیہ قرار دے دیا ہے۔ تو امام اعظمؒ کے نزدیک اسے نصاب شمار کیا جائے گا۔ کیونکہ امام اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق قاضی کا کسی شخص کو دیوالیہ قرار دینا درست نہیں۔

امام محمدؒ کے نزدیک قرض خواہ پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مقروض کا دیوالیہ پن ثابت ہو چکا ہے اور قاضی اسے دیوالیہ قرار دے چکا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی رائے ــــ قاضی کے دیوالیہ قرار دینے سے کسی شخص کے دیوالیہ ہونے میں ــــ امام محمدؒ کے ساتھ ہے۔ لیکن زکاۃ کے واجب ہونے میں وہ امام اعظمؒ کی تائید کرتے ہیں۔ جس میں فقراء اور مساکین کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے باندی کو تجارت کی غرض سے خرید کیا اور بعد میں اسے اپنی خدمت پر مامور کرنے کی نیت کر لی تو اس باندی کی زکاۃ ساقط ہو جائے گی۔

کیونکہ نیت عمل کے ساتھ متصل ہے اور عمل اس میں یہ ہے کہ اس نے اسے مال تجارت سے الگ کر دیا ہے ۔

اگر اس کے بعد اس نے باندی سے متعلق یہ نیة کی کہ وہ اسے مال تجارت شمار کرے گا ، تو یہ باندی اس وقت تک مال تجارت شمار نہ ہوگی ۔ جب تک اسے فروخت نہ کر ڈالے۔ اس کی فروختگی پر اس کی قیمت پر زکاة ہوگی کیونکہ نیة عمل کے ساتھ متصل نہیں ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ابھی تک اس کی تجارت نہیں کی ۔ لہذا فقط نیة کا اعتبار نہ ہوگا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک مسافر محض نیة ہی سے مقیم شمار ہوتا ہے ، لیکن ایک مقیم اس وقت تک مسافر نہیں ہوتا جب تک وہ سفر نہ کرے ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے کوئی چیز خریدی اور اس کی تجارة کی نیة کرلی تو اس پر مال تجارة کا اطلاق ہوگا ۔ کیونکہ نیة عمل کے ساتھ متصل ہے (لہذا اس مال پر زکاة واجب ہوگی) ۔ بخلاف اس صورة کے کہ جب ایک شخص کسی مال کا وارث بنے اور اس ترکے میں تجارة کی نیة کرے ۔ کیونکہ اب اس نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس سے تجارة کا حکم ظاہر ہو ۔ (لہذا جب تک اس مال کو بیچ نہ ڈالے ، اس پر زکاة واجب نہ ہوگی) ۔

اگر کوئی شخص ھبہ سے یا وصیة سے یا نکاح سے یا خلع سے یا قصاص کے متعلق صلح سے کسی مال کا مالک بن جائے اور وہ اس مال میں تجارت کی نیة کرلے ، تو امام ابو یوسف رح

کے نزدیک اس پر مال تجارۃ کا اطلاق ہوگا کیونکہ نیۃ کے ساتھ عمل متصل ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک اس کو مال تجارۃ شمار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نیۃ کے ساتھ تجارۃ کا کوئی عمل متصل نہیں۔ (لہذا اس پر زکاۃ اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک اسے فروخت نہ کر دیا جائے)۔ بعض روایات میں ائمہ کا یہ اختلاف برعکس منقول ہوا ہے۔

مسئلہ: زکاۃ کی ادائیگی اس وقت تک جائز نہ ہوگی۔ جب تک کہ اس کے ادا کرتے وقت یا زکاۃ کی مقررہ تعداد کو الگ کرتے وقت زکاۃ کی نیۃ نہ کرلی جائے، کیونکہ زکاۃ عبادۃ ہے۔ لہذا نیۃ اس کے لیے شرط ہے اور اس مسئلے میں اصل چیز یہ ہے کہ نیۃ کا متصل ہونا (ادائیگی کے وقت ضروری ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ زکاۃ مختلف وقتوں میں یعنی متعدد بار ادا کی جائے تو اس صورۃ میں اگر اس شخص نے زکاۃ کی رقم الگ کرتے وقت زکاۃ کی نیۃ کر لی تو جواز زکاۃ کے لیے کافی ہے۔ اس میں وہی آسانی ہے جیسا کہ رمضان المبارک میں اگر کوئی شخص شروع سے نیۃ کرلے (کہ پورے ماہ کے روزے رکھے گا تو اسے ہر روز اعادۂ نیۃ کی ضرورۃ نہیں)۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص پورا مال خیرات کر دے اور زکاۃ کی نیۃ نہ کرے تو بھی اس سے فریضۂ زکاۃ ساقط ہو جائے گا۔ استحسان یا مناسب بات یہی ہے کیونکہ (بطور

زکاۃ) واجب ہونے والی رقم اس پورے مال کا ایک حصہ ہی تھی ۔ لہذا وہ اس میں متعین تھی ، چنانچہ الگ تعین کرنے کی اس (صورۃ) میں کوئی حاجۃ نہیں ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے نصاب کا بعض حصہ ادا کیا تو اس ادا شدہ حصہ کی زکاۃ اس سے ساقط ہو جائے گی ۔ یہ رائے امام محمدؒ کی ہے ، ان کی دلیل یہ ہے کہ زکاۃ کا وجود پورے مال میں سرایت کیے ہوئے ہے ۔ (لہذا جتنا مال ادا ہو چکا ہے اس میں سرایت شدہ زکاۃ کا حصہ بھی ادا ہو چکا ہے اور باقی کے مال پر زکاۃ واجب نہیں) ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس سے زکاۃ ساقط نہیں ہوگی (بلکہ اس پر پورے مال کی زکاۃ واجب ہوگی) ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس کا بعض حصہ متعین نہیں کیونکہ باقی ماندہ رقم بھی وجوب زکاۃ کا محل بن چکی ہے ۔ (ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ رقم میں واجب شدہ زکاۃ موجود ہو تو ادائیگی کیسے ممکن ہے بخلاف پہلی صورۃ کے جب کہ پورا مال خیرات میں دے دیا گیا ۔ کیونکہ اس صورۃ میں بچتا تو کچھ بھی نہیں جو وجوب زکاۃ کا محل بن سکے) ۔ (مثلاً ایک شخص کے پاس دو سو درہم تھے ۔ اس نے ایک صد بطور خیرات تقسیم کر دیے تو امام محمدؒ کے نزدیک بقدر اڑھائی درہم زکاۃ ادا ہوگی ۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر پانچ درہم بطور زکاۃ واجب ہیں) ۔ حقیقت حال سے اللہ تعالی ہی آگاہ ہے ۔

بَابُ صَدَقه السَّوائِم

مویشیوں کی زکاۃ کا بیان

اونٹوں کی زکاۃ

(چراگاہ میں سب سے اہم چرنے والا جانور اونٹ ہے اس لیے آغاز اسی سے ہوتا ہے) .

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ پانچ اونٹوں سے کم پر زکاۃ واجب نہیں . لیکن جب تعداد پانچ تک پہنچ جائے اور انھوں نے سال کا اکثر و بیشتر حصہ چراگاہ میں گزارا ہو . اور ایک سال ان پر گذر جائے تو ان پر ایک بکری زکاۃ کے طور پر واجب ہوگی . اونٹوں کی تعداد نو ہونے تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : جب ان کی تعداد دس ہو جائے تو دو بکریاں واجب ہوں گی . چودہ (۱۴) ہونے تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : لیکن جب اونٹوں کی تعداد (۱۵) ہو جائے تو ان پر تین بکریاں زکاۃ کے طور پر واجب ہوں گی . انیس (۱۹) تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : اور جب تعداد بیس ہو جائے تو چار (۴) بکریاں واجب ہوں گی . چوبیس (۲۴) تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : جب ان کی تعداد پچیس ہو جائے تو ان پر ایک بنت مخاض واجب ہوگی ۔

بنت مخاض اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کا ایک سال پورا کرنے کے بعد دوسرے میں قدم رکھ چکی ہو ۔ پنتیس (۳۵) تک زکاۃ کا یہی حکم رہے گا ۔

مسئلہ : جب اونٹوں کی تعداد چھتیس (۳٦) ہو جائے، تو ان پر ایک بنت لبون زکاۃ کے طور پر واجب ہوگی ۔ یہ وہ اونٹنی ہے جو اپنی عمر کے دو سال پورا کرنے کے بعد تیسرے میں قدم رکھ چکی ہو ۔ پنتالیس (۴۵) اونٹوں تک یہی حکم رہے گا ۔

مسئلہ : جب اونٹوں کی تعداد چھیالیس (۴٦) ہو جائے تو ان پر ایک حقّہ اونٹنی واحب ہوگی ۔ حقہ وہ اونٹنی ہے جو اپنی عمر کے تین سال پورا کر چکنے کے بعد چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو ۔ اونٹوں کی تعداد ساٹھ (٦۰) ہونے تک یہی حکم رہے گا ۔

مسئلہ : جب ان کی تعداد اکسٹھ (٦۱) ہو جائے، تو ان پر ایک جذعہ اونٹنی زکاۃ کے طور پر واجب ہوگی۔ جذعہ وہ اونٹنی ہے جو اپنی عمر کے چار (۴) سال پورا کرنے کے بعد پانچویں برس میں قدم رکھ چکی ہو ۔ پچھتر (۷۵) اونٹوں تک یہی حکم رہے گا۔

مسئلہ : اور جب اونٹوں کی تعداد چھہتر (۷٦) ہو جائے تو دو بنت لبون اونٹنیاں زکاۃ کے طور پر واجب ہوں گی ۔

نوے (۹۰) تک یہی حکم رہے گا۔

مسئلہ: جب ان کی تعداد اکیانوے (۹۱) ہو جائے، تو ان پر دو حقہ اونٹنیاں زکاۃ کے طور پر واجب ہوں گی۔ ایک سو بیس (۱۲۰) اونٹوں تک یہی حکم رہے گا۔

زکاۃ کے یہ احکام وہ مشہور احکام ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے مختلف فرامین تھے جو آپ نے گورنروں کو روانہ کیے۔

مسئلہ: جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) سے بڑھ جائے تو حساب از سر نو کر لیا جائے۔ چنانچہ پانچ اور زائد اونٹوں پر (دو حقہ اونٹنیوں کے ساتھ ساتھ) ایک بکری بطور زکاۃ واجب ہوگی۔ دس (۱۰) پر دو (۲) بکریاں، پندرہ پر تین (۳) بکریاں اور بیس پر چار (۴) بکریاں واجب ہوں گی۔ پچیس (۲۵) اونٹوں کے زائد ہونے پر ایک بنت مخاض واجب ہوگی۔ اونٹوں کی تعداد ایک سو پچاس (۱۵۰) ہونے پر تین حقہ اونٹنیاں واجب ہوں گی۔ اس کے بعد حساب از سر نو کیا جائے گا۔ چنانچہ پانچ (۵) پر ایک، دس (۱۰) پر دو (۲)، پندرہ پر تین (۳) بکریاں واجب ہوں گی اور بیس (۲۰) پر چار (۴)۔

اونٹوں کی تعداد جب پچیس (۲۵) ہو جائے تو ایک بنت مخاض واجب ہوگی اور چھتیس پر ایک بنت لبون۔ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو چھیانوے (۱۹۶) ہو جائے تو چار (۴) حقہ اونٹنیاں واجب ہوں گے۔ اس کے بعد حساب خواہ وہ کہیں تک بھی چلا جائے، اسی پچاس کے حساب کے مطابق کیا

جانے گا جو ایک سو پچاس سے دو سو تک شمار کیا گیا ہے یہ رائے احناف کی ہے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اونٹوں کی تعداد جب ایک سو بیس (۱۲۰) سے زیادہ ہو جائے تو ان پر تین (۳) بنت لبون اونٹنیاں بطور زکاۃ واجب ہوں گی ۔

جب ان کی تعداد ایک سو تیس (۱۳۰) ہو جائے تو اس پر ایک حقہ اونٹنی اور دو (۲) بنت لبون اونٹنیاں بطور زکاۃ واجب ہوں گی ۔

اس کے بعد حساب کا انحصار اس اصول پر ہوگا کہ ہر چالیس (۴۰) اور ہر پچاس (۵۰) پر الگ الگ زکاۃ لی جائے گی ۔ چنانچہ ہر چالیس (۴۰) پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس (۵۰) پر ایک حقہ اونٹنی واجب ہوگی ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمان تحریر فرمایا تھا کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) سے بڑھ جائے تو ہر پچاس (۵۰) پر ایک حقہ اور ہر چالیس پر ایک بنت لبون اونٹنی بطور زکاۃ واجبہ ہوگی اور اس کے درمیان جو تعداد ہے اس پر کوئی زکاۃ نہ ہوگی ۔

احناف کی یہ دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عمرو بن حزمؓ کو جو فرمان ارسال فرمایا اس کے آخر میں یہ لکھا تھا کہ جو تعداد ان سے کم ہو اس پر ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری بطور زکاۃ واجب ہوگی ۔ لہذا ہم اس اضافے پر عمل کریں گے (کیونکہ اضافہ والی حدیث پر عمل کرنے

میں زیادہ احتیاط ہے) . بختی اونٹوں اور عربی اونٹوں میں کوئی فرق نہیں (زکاۃ کے واجب ہونے میں دونوں قسمیں مساوی ہوں گی) کیونکہ اونٹ کے اسم کا مطلق ہونا دونوں کو شامل ہے . واللہ أعلم بالصواب .

فَصْلٌ فِی الْبَقَرِ

گائے کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : گائے کی تعداد اگر تیس (۳۰) سے کم ہو (اور وہ چراگاہ میں سال کا اکثر حصہ چرنے والی ہوں) تو ان پر زکاۃ واجب نہیں .

مسئلہ : جب یہ تعداد تیس (۳۰) ہو جائے اور انہوں نے سال کا اکثر و بیشتر حصہ چراگاہ میں گزارا ہو اور ان پر ایک سال کی مدۃ گزر جائے تو ان پر ایک تبیع یا تبیعہ (یعنی بچھڑا یا بچھڑی) بطور زکاۃ واجب ہوگا . تبیع سے مراد گائے کا وہ بچہ ہے جو عمر کا ایک سال گزار کر دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو .

مسئلہ : گائے کی تعداد جب چالیس ہو جائے (اور باقی تمام شرائط پوری ہو رہی ہوں) تو ان پر ایک مسن یا مسنۃ بطور زکاۃ واجب ہوگا اور مسن گائے کے اس بچے کو کہتے ہیں . جو عمر کے دو سال گزار کر تیسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو .

نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو گائے کی زکاۃ کے سلسلے میں یہی حکم دیا تھا .

مسئلہ : جب گائے کی تعداد چالیس (۴۰) سے بڑھ جائے تو ہر زائد گائے پر زکاۃ واجب ہوگی اور ساٹھ (۶۰) تک اسی حساب سے واجب ہوتی چلی جائے گی ۔ مسئلے کی یہ صورۃ امام اعظمؒ کے نزدیک ہے ۔ چنانچہ جب چالیس (۴۰) پر ایک گائے زائد ہو تو مسنہ کا ۱/۴۰ حصہ دینا ہوگا اور جب دو ہوں تو ۱/۲۰ مسنہ ، گائے کی تعداد تین زائد ہونے پر ۳/۴۰ مسنہ کی قیمت بطور زکاۃ واجب ہوگی ۔ یہ مسئلہ امام محمدؒ نے بروایۃ ابو یوسفؒ مبسوط میں بیان کیا ہے ۔ کیونکہ عفو نص سے ثابت ہے اگرچہ قیاس کے خلاف ہے اور اس حکم میں کوئی نص موجود نہیں ۔ (یعنی تیس (۳۰) سے چالیس (۴۰) کی درمیانی تعداد پر زکاۃ نہیں ۔ اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ درمیانی تعداد پر بھی زکاۃ واجب ہوتی ۔ لیکن چونکہ نبی اکرم ﷺ نے حکم دے دیا کہ تیس پر ایک تبیعہ اور چالیس پر ایک مسنہ واجب ہے ۔ لہذا اس فرمان کی روشنی میں قیاس کو ترک کر دیا جائے گا اور درمیانی تعداد پر زکاۃ نہیں لی جائے گی ۔ مگر چالیس (۴۰) اور ساٹھ (۶۰) کی درمیانی تعداد کے متعلق کوئی نص موجود نہیں ۔ لہذا اس تعداد پر بھی زکاۃ واجب ہوگی ۔ کیونکہ عفو کا ثبوت بغیر نص کے ممکن نہیں) ۔

امام حسنؒ نے امام اعظمؒ سے ایک روایت یوں نقل کی ہے کہ اس زیادتی پر کچھ واجب نہ ہوگا ۔ جب تک کہ تعداد پچاس (۵۰) تک نہ پہنچ جائے اور جب گائے کی تعداد

پچاس (۵۰) ہو جائے، تو اس پر ایک مسنہ اور ایک مسنہ کا ۱/۴ حصہ بطور زکاۃ واجب ہوگا یا ۱/۳ تبیعہ اور ایک مسنہ واجب ہوگا۔ کیونکہ اس نصاب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ہر دو عقدوں (دہائیوں) کی درمیانی تعداد میں عفو ہے اور ہر عقد میں واجب ہے (یعنی جس طرح تیس اور چالیس کی درمیانی تعداد پر زکاۃ معاف ہے، اسی طرح چالیس اور پچاس، پچاس اور ساٹھ کی درمیانی تعداد پر بھی معاف ہو۔ صرف دہائیوں جیسے ۳۰، ۴۰، پچاس اور ۶۰ وغیرہ پر واجب ہو۔ (اس قول کے مطابق حاصل یہ ہوا کہ دہائیوں پر زکاۃ واجب ہوگی اور کسروں (درمیانی تعداد) پر معاف ہوگی)۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ زیادتی پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی۔ حتی کہ تعداد ساٹھ ہو جائے اور یہی قول ایک روایت میں امام اعظمؒ سے بھی منقول ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو ارشاد فرمایا کہ گائے کے اوقاص (کسروں یعنی دہائیوں کی درمیانی تعداد) پر زکاۃ وصول نہ کریں۔

اھل لغۃ نے اس کی جو شرح بیان کی ہے اس میں اسے چالیس (۴۰) کی تعداد سے لے کر ساٹھ (۶۰) کی تعداد تک کے حصے کو وقص قرار دیا گیا ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ان (اوقاص) سے مراد گائے کے بچے ہیں (کہ جب گائے کے بچے ساتھ ہوں تو ان پر زکاۃ نہیں لی جائے گی)۔

مسئلہ : جب گائے کی تعداد ساٹھ (۶۰) ہو جائے تو

اس پر دو تبیعہ بطور زکاۃ واجب ہوں گے .

مسئلہ : جب تعداد ستر (۷۰) ہو جائے تو ایک مسنہ اور ایک تبیعہ واجب ہوگا .

مسئلہ: جب تعداد اسی (۸۰) ہو تو دو مسنے واجب ہونگے.

مسئلہ : جب نوے (۹۰) تک تعداد پہنچ جائے تو تین (۳) تبیع واجب ہوں گے .

مسئلہ : جب گائیں سو (۱۰۰) تک پہنچ جائیں تو دو تبیع اور ایک مسنہ واجب ہوں گے .

اسی حساب سے زکاۃ کا واجب ہونا ، ہر دس کے اضافے پر ، تبیعہ سے مسنہ کی طرف اور مسنہ سے تبیعہ کی طرف، تبدیل ہوتا رہے گا . کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر تیس (۳۰) گائے پر ایک تبیع یا تبیعہ اور ہر چالیس (۴۰) گایوں پر ایک مسن یا مسنہ بطور زکاۃ واجب ہے .

مسئلہ : بھینس اور گائے زکاۃ کے معاملے میں مساوی ہوں گی . اس لیے کہ لفظ بقر دونوں کو شامل ہے کیونکہ بھینس ، گائے ہی کی ایک قسم ہے . البتہ لوگوں کے ذہن ہمارے علاقے میں اس طرف جلد منتقل نہیں ہوتے . کیونکہ یہاں بھینس کم پائی جاتی ہے ، اسی بناء پر اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی کہ وہ بقر کا گوشت نہیں کھائے گا اور اس نے بھینس کا گوشت کھا لیا تو وہ اپنی قسم میں حانث نہیں ہوگا . (اس لیے کہ ہمارے علاقے میں بقر سے مراد گائے ہی ہے) واللہ أعلم بالصواب .

فَصْلٌ فی الْغَنَم

بھیڑ بکریوں کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : بکریوں کی تعداد جب چالیس (۴۰) سے کم ہو اور وہ (سال کا بیشتر حصہ چراگاہ میں) چرنے والی ہوں تو ان پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی .

مسئلہ : جب ان کی تعداد چالیس (۴۰) ہو جائے اور وہ سال کا بیشتر حصہ چراگاہ میں چرنے والی ہوں اور ان پر ایک سال کی مدۃ گزر جائے تو ان پر ایک بھیڑ یا بکری واجب ہوگی . ایک سو بیس (۱۲۰) تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : جب اس تعداد پر ایک بکری کا اضافہ ہو جائے تو دو بکریاں بطور زکاۃ واجب ہوں گی . دو صد (۲۰۰) بھیڑ بکری تک یہی حکم رہے گا .

مسئلہ : جب دو سو ایک (۲۰۱) ہو جائیں تو تین بکریاں بطور زکاۃ واجب ہوں گی .

مسئلہ : جب تعداد چار سو (۴۰۰) تک پہنچ جائے تو چار بکریاں بطور زکاۃ واجب ہوں گی .

مسئلہ : پھر ہر سو (۱۰۰) پر ایک بکری زکاۃ کے طور پر دی جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے فرامین میں یہی احکام مندرج ہیں اور اسی پر اجماع امۃ ہے۔

مسئلہ : بھیڑ اور بکری زکاۃ کے سلسلے میں مساوی ہیں۔ کیونکہ لفظ غنم ان دونوں کو شامل ہے اور نص میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مسئلہ : زکاۃ میں صرف ثنی قبول کیا جائے گا اور بھیڑ کا جذع نہیں لیا جائے گا۔ البتہ امام حسنؒ نے امام اعظمؒ سے یہ روایۃ بیان کی ہے (جس میں زکاۃ کے سلسلے میں جذع کا لینا بھی درست ہے) "ثنی" وہ بھیڑ بکری ہے جو اپنی عمر کا ایک سال پورا کر چکی ہو اور "جذع" بھیڑ بکری کا وہ بچہ ہے جس کی عمر نصف سال سے متجاوز ہو چکی ہو۔

امام ابو حنیفہؒ سے ایک قول بیان کیا گیا ہے اور اسی قول کی تائید صاحبینؒ سے بھی مروی ہے کہ جذع کو بھی زکاۃ میں قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بے شک زکاۃ میں ہمارا حق جذع اور ثنی ہے۔

اس کی عقلی توجیہ یہ بھی ہے کہ قربانی میں بھی جذع قبول کیا جاتا ہے۔ لہذا زکاۃ میں بھی اسے جائز قرار دیا جائے گا۔ (سوال۔ کیا وجہ ہے کہ امام سے دو متضاد روایتیں منقول ہیں۔ ایک روایۃ کے مطابق جذع قابل قبول ہے اور دوسری کے مطابق نہیں۔ شارحؒ اس کی توجیہ

کرتے ہوئے فرماتے ہیں) . پہلی روایۃ کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے مرفوع اور موقوف ہر دو طریقوں سے یہ روایۃ منقول ہے کہ زکاۃ میں صرف ثنی قبول کیا جائے گا اور وہ جو اس سے زیادہ عمر کا ہو .

نیز زکاۃ میں جو جانور دیا جائے وہ متوسط درجے کا ہو اور اس جذع کا شمار ابھی بچوں میں ہوتا ہے . اسی بناء پر بکری کا چھوٹا بچہ زکاۃ میں دینا جائز نہیں .

جہاں تک قربانی میں اس کے جائز ہونے کا تعلق ہے وہ اس لیے ہے کہ اس کا ثبوت نص شرعی ہے اور روایۃ مذکورہ میں جذع سے مراد اونٹ کا بچہ ہے .

مسئلہ : بھیڑ بکریوں کی زکاۃ میں نر اور مادہ دونوں دی جا سکتی ہیں ، کیونکہ لفظ شاۃ دونوں کو شامل ہے . نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے : فی أربعین شاۃ شاۃ . یعنی چالیس بکریوں پر ایک بکری زکاۃ کے طور پر واجب ہوگی . واللہ أعلم بالصواب .

فَصْلٌ فِی الْخَیْل

گھوڑوں کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : جب چراگاہ میں چرنے والے گھوڑے کسی مسلمان کے پاس موجود ہوں اور ان میں نر و مادہ مخلوط ہوں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ چاہے تو ہر گھوڑے کی طرف سے ایک دینار ادا کر دے اور چاہے تو ان کی قیمت کا تخمینہ لگا لے اور ہر دو سو درہم پر پانچ درہم زکاۃ ادا کرے ۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے اور امام زفرؒ کا بھی یہی قول ہے ۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑوں پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ مسلمان کے غلام اور گھوڑے پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی ۔

امام اعظمؒ دلیل میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں کہ ''ہر وہ گھوڑا جو چراگاہ میں چرنے والا ہو اس پر ایک دینار یا دس درہم واجب ہوں گے" جہاں تک اس روایۃ کے مفہوم کا تعلق ہے جو صاحبینؒ نے بیان کی ہے اس سے مراد غازی کا گھوڑا ہے اور یہ حضرت زید بن ثابتؓ سے

منقول ہے۔ جہاں تک دینار یا قیمت کے تخمینہ لگانے میں اختیار کا تعلق ہے تو یہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے۔

مسئلہ : اگر کسی شخص کے پاس محض گھوڑے ہی گھوڑے ہوں تو ان پر زکاۃ واجب نہ ہوگی۔ کیونکہ ان سے افزائش نسل نہیں ہوسکتی۔ (لہذا یہ مال نامی نہ رہا)۔

مسئلہ : اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس صرف گھوڑیاں ہی ہوں (ان پر بھی زکاۃ واجب نہیں ہوگی) لیکن اس میں امام اعظمؒ سے ایک روایۃ بھی ہے کہ صرف گھوڑیاں ہونے کی صورۃ میں زکاۃ واجب ہوگی۔ کیونکہ فحل المستعار (عاریۃً لیے ہوئے سانڈ) سے افزائش نسل ہو سکتی ہے۔ بخلاف اس صورۃ کے جب کہ صرف گھوڑے ہوں۔

ایک اور روایۃ امام اعظمؒ سے یہ بھی ہے کہ اگر صرف گھوڑے ہی ہوں تب بھی زکاۃ واجب ہوگی (کیونکہ آخر گھوڑے بھی تو مال کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی قیمت میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے)۔

مسئلہ : خچر یا گدھے پر زکاۃ نہیں ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ خچر یا گدھے کی زکاۃ کے بارے میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ اور مقداریں سماعی طور پر ہی ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ اس صورۃ میں جب کہ یہ تجارۃ کے لیے ہوں۔ کیونکہ ان کے مال تجارۃ ہونے کی صورۃ میں زکاۃ ان کی مالیۃ سے متعلق ہوگی۔ جیسا کہ تجارۃ کے دوسرے اموال و اسباب ہیں۔

فصل

شتر بچوں، بزغالوں اور گوسالوں کی زکاۃ کا بیان

شتر بچوں ، بکری کے بچوں اور گائے کے بچوں پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی . جب تک کہ ان میں کوئی بڑا جانور نہ ہو (یا وہ ملے جلے نہ ہوں) یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے اور یہ ان کا آخری قول ہے . امام محمدؒ کی رائے کے مطابق جو امام اعظمؒ کی پہلی رائے تھی ان بچوں پر بھی وہی زکاۃ واجب ہوگی جو بڑوں پر ہوتی ہے . یہی رائے امام زفرؒ اور امام مالکؒ کی بھی ہے . اس کے بعد امام اعظمؒ نے اس رائے سے رجوع فرما لیا اور کہا کہ انہی بچوں میں سے بچہ بطور زکاۃ واجب ہوگا . امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ بھی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں .

امام اعظمؒ کی پہلی رائے کی توجیہ یہ تھی کہ شرعی خطاب میں جو نام مذکور ہوا ہے وہ مطلق ہے . لہذا اس میں چھوٹے بڑے دونوں شامل ہیں .

دوسری رائے کی توجیہ یہ ہے (یعنی جب کہ بچوں ہی سے ایک بچہ زکاۃ میں دیا جائے). زکاۃ کی ادائیگی میں طرفین

کا خیال اسی طرح ملحوظ رکھنا چاہیے ، جیسا کہ اس صورۃ میں ملحوظ رکھا جاتا ہے جب کہ نصاب کے سارے جانور دبلے اور لاغر ہوں (اگر کسی شخص کے پاس طاقت ور اور کمزور دونوں قسم کے ملے جلے جانور ہوں تو متوسط جانور بطور زکاۃ دیا جائے گا. مگر جب سارے جانور لاغر اور دبلے ہوں تو انھیں میں سے ایک دبلا جانور ہی زکاۃ میں دیا جائے گا) .

امام کے آخری قول کی وجہ یہ ہے کہ نصاب شرعی کی مقداروں میں قیاس کو دخل نہیں ہوتا . (ہم اپنے قیاس سے کچھ تغیر نہیں کر سکتے) . لہذا جب شریعۃ اسلامیہ میں ان بچوں کے بارے میں کوئی حکم وارد نہیں ہوا تو ہم ان پر سرے سے کوئی زکاۃ واجب نہیں کریں گے . لیکن اس صورۃ میں جب ان میں کوئی بڑا جانور بھی شامل ہو تو چھوٹے جانور بڑے جانور کے تابع شمار ہوں گے جس سے نصاب شرعی کا انعقاد ہو جائے گا. لیکن ان (بچوں کو) زکاۃ کی ادائیگی میں نہیں دیا جائے گا (بلکہ زکاۃ میں وہ جانور دیا جائے گا جو شریعۃ نے مقرر کیا ہے) .

امام ابو یوسف کے نزدیک بکری کے بچوں کی تعداد جب تک چالیس اور گائے کے بچوں کی تعداد تیس نہ ہو جائے ، ان پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی . شتر بچوں کی تعداد جب پچیس ہو جائے تو ان پر ایک شتر بچہ بطور زکاۃ واجب ہوگا . پھر ان پر اس وقت تک زکاۃ واجب نہ ہوگی . جب تک تعداد

اس حد تک نہ پہنچ جائے یعنی اس حد تک کہ اگر بڑے
ہوتے تو زکاۃ میں دو جانور دیے جاتے (یہ تعداد ۷۶ ہے
جب بڑے اونٹ ۷۶ ہوں تو دو بنت لبون دی جاتی ہیں .
گویا جب تک شتر بچوں کی تعداد (پچیس سے آگے) بڑھتے بڑھتے
چھہتر تک نہ پہنچے زکاۃ میں اضافہ نہ ہوگا . (چھہتر ہونے
پر دو بچے دیے جائیں گے). چھہتر سے زیادہ تعداد پر شتر بچوں
پر کچھ واجب نہ ہوگا . جب تک کہ یہ مقدار اس حد تک
نہ پہنچ جائے کہ اگر یہ بڑے ہوتے تو تین جانور زکاۃ میں
دیے جاتے (گویا کہ شتر بچوں پر ۷۶ کے بعد ۱۴۵ ہونے
تک کچھ واجب نہیں ہوگا . جب ۱۴۵ بڑے اونٹ ہوں تو
ان پر تین اونٹنیاں بطور زکاۃ دی جاتی ہیں . لہذا تین شتر
بچے زکاۃ میں دیے جائیں گے) .

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک پچیس سے کم شتر بچوں پر
زکاۃ واجب نہیں ہوگی . ایک دوسری روایۃ میں ان کے
نزدیک پانچ شتر بچوں پر ایک بچہ کی قیمت کا $\frac{1}{5}$ حصہ دیا
جائے گا اور دس پر شتر بچے کی قیمت کا $\frac{2}{5}$ حصہ واجب ہوگا
اور اسی حساب سے ان کی تعداد کے مطابق زکاۃ ادا کی
جائے گی .

امام ابو یوسفؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ $\frac{1}{5}$ شتر
بچے کی قیمت اور متوسط درجے کی ایک بکری کی قیمت میں
موازنہ کرنے کے بعد جو ان میں سے کم ہو زکاۃ کے طور پر
واجب قرار دیتے ہیں .

جب شتر بچوں کی تعداد دس ہو جائے تو دو بکریوں کی قیمت اور ⅖ شتر بچے کی قیمت کا مقابلہ کیا جائے گا اور ان میں جو قیمت کم ہوگی اسی کے مطابق زکاۃ واجب ہوگی۔

مسئلہ : اگر کسی شخص پر زکاۃ کے طور پر بڑا جانور واجب ہو اور اس کے پاس نہ ہو تو مصدق اس سے بڑھیا جانور قبول کر سکتا ہے اور دونوں کی قیمت میں جو فرق ہو ، وہ صاحب مال کو واپس لوٹا دے گا (مثلا جو جانور واجب تھا اس کا نرخ (Market Price) ایک سو روپیہ ہے اور اعلی کی قیمت ایک سو اسی (۱۸۰) روپے ہے تو زکاۃ وصول کرنے والا سو روپیہ رکھ لے اور اسی (۸۰) واپس لوٹا دے) یا اس (واجب شدہ جانور) سے ادنی لے کر دونوں کی قیمت کا فرق صاحب مال سے وصول کر لے۔ (مثلاً ادنی جانور کی قیمت پچاس (۵۰) روپے ہے اور واجب شدہ جانور کی قیمت بازار میں ایک سو روپیہ ہے تو مصدق ادنی جانور وصول کرنے کے علاوہ مالک سے پچاس (۵۰) روپے بھی وصول کرے گا)۔

اس مسئلے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ زکاۃ کے سلسلہ میں واجب شدہ شے کی بجائے اس قیمت کا ادا کرنا ہمارے ہاں جائز ہے جیسا کہ ہم عنقریب بیان کریں گے۔ البتہ پہلی صورۃ میں (جب کہ واجب شدہ جانور سے بڑھیا ہو) مصدق کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس جانور کو نہ لے، اور جو واقعی اس پر واجب ہو رہا ہے اسی کا مطالبہ کرے ، یا اس کی قیمت طلب کرے کیونکہ مذکورہ صورۃ دراصل

تجارۃ کی ایک قسم ہے ۔ (اس لیے مالک مال یہ نہیں کر سکتا کہ اعلی جانور دے کر مصدق کو بقایا فرق دینے پر مجبور کرے ، کیونکہ بیع و شراء میں جبر جائز نہیں بلکہ مصدق کو بقایا فرق دینے یا جانور کی قیمت وصول کرنے میں اختیار ہوگا) ۔ لیکن دوسری صورۃ میں زکاۃ لینے والے کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ گھٹیا جانور لے کر بقایا فرق بھی وصول کر لے کیونکہ اس صورۃ میں اس میں تجارۃ کا پہلو موجود نہیں بلکہ یہ قیمت کی ادائیگی ہی کی ایک صورۃ ہے ۔

مسئلہ : احناف کے نزدیک زکاۃ میں واجب شدہ چیز کی بجائے اس کی قیمت ادا کرنا جائز ہے ۔ اسی طرح کفاروں میں یا صدقہ فطر میں یا عُشر میں یا نذر میں کسی شیء واجب کی بجائے اس کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں ایسا کرنا جائز نہیں (امام احمدؒ اور مالکؒ بھی اسی کے قائل ہیں ۔ ہاں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سونے کی بجائے چاندی یا چاندی کی جگہ سونا دیا جا سکتا ہے) تا کہ نصوص قطعیہ کی پیروی کی جا سکے ۔ جیسا کہ ھدیہ کے یا قربانی کے جانوروں کی صورۃ ہے (ھدیہ کے جانوروں یا قربانی کے جانوروں کی بجائے ان کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی بلکہ ان کا قربان کرنا ضروری ہے ۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ زکاۃ تنگدست کو ادا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے جو رزق پہنچانے کا وعدہ (فقراء سے) کر رکھا ہے انھیں پہنچایا جائے (یعنی نادار کی مدد اور

اعانۃ ہو جائے) لہذا اس پر بکری کی قید لگانا (کہ شتر بچوں کی زکاۃ میں بکری ہی مخصوص کی جائے) اس مقصد کو باطل کر دے گا۔ لہذا اس کی حیثیت جزیہ کی ہوگی۔ (جزیہ میں واجب چیز بھی دی جا سکتی ہے اور قیمت بھی)۔

جہاں تک امام شافعیؒ نے ہدیہ کے جانوروں پر قیاس کیا ہے۔ وہ صورۃ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہاں عبادۃ کا پہلو ہے کہ خون بہایا جائے (اور خون بہانے کی بجائے اس کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی (اور خون بہانے کا عبادۃ قرار پانا) خلاف قیاس ہے۔

اور جہاں تک متنازع فیہ مسئلے کا تعلق ہے۔ (آیا واجب شدہ چیز کی بجائے اس کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں) اس میں عبادۃ یا قربت کا پہلو یہ ہے کہ محتاج کی ضرورۃ کو پورا کیا جائے اور یہ موافق قیاس بھی ہے (کہ محتاج کی ضرورت پورا کرنے کے لیے قیمت بھی دی جا سکتی ہے)۔ [علم اصول کا مسلمہ قانون ہے کہ جو حکم قیاس کے مطابق نہ ہو اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ قربانی کے جانوروں میں خون بہانا ہی قربت و عبادت ہے مگر یہ حکم قیاس میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ اگر قربانی کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر دی جائے تو وہ کئی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ حکم قیاسی نہیں لہذا خون بہانا ہی قربت ہوگا، اس کے بدلہ میں قیمت دینا جائز نہ ہوگا۔

جو حکم مطابق قیاس ہو وہاں تبدیلی بھی جائز ہے۔ جیسا کہ زکاۃ کی فرضیۃ غریبوں کی اعانت کے لیے ہے اور یہ حکم قیاس میں بھی آ جاتا ہے اس لیے واجب شیء کے علاوہ قیمت دینا بھی جائز ہوگا۔ وھو لا یعقل سے مراد خلاف قیاس ہے اور وھو معقول سے مراد موافق قیاس ہے]۔

مسئلہ: کھیتوں میں کام کرنے والے اور باربرداری کے جانوروں پر نیز ان جانوروں پر جن کی پرورش گھر پر ہو رہی ہو (کہ مالک سال کا اکثر و بیشتر حصہ انہیں گھر پر ہی چارا کھلائے) زکاۃ واجب نہیں۔

اس مسئلہ میں امام مالکؒ کو اختلاف ہے۔ وہ نصوص کے ظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔ احناف کی دلیل نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ بار بردار جانوروں، کام کرنے والے جانوروں اور ایسے بیلوں پر جو کہ زمین جوتنے پر استعمال کیے جاتے ہوں زکاۃ واجب نہیں ہوگی۔

اس کی عقلی توجیہ یہ ہے کہ زکاۃ کے واجب ہونے کا اصلی سبب نصاب کا مال نامی ہونا ہے اور مال نامی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ جانور سال کا اکثر و بیشتر حصہ چراگاہ میں چریں یا انہیں تجارۃ کے لیے رکھا جائے اور یہ دونوں باتیں مذکورہ بالا صورۃ میں نہیں پائی جاتیں۔ نیز گھر پر چارا کھانے والے جانوروں پر مالک کو مسلسل مالی مشقۃ برداشۃ کرنا پڑتی ہے۔ لہذا معنوی حیثیت سے اس کا مال نامی ہونا کالعدم ہو جاتا ہے۔

سائمہ سے مراد وہ جانور ہیں جو سال کا اکثر و بیشتر حصہ چراگاہ میں چرنے پر اکتفا کریں ، حتی کہ اگر مالک سال کا نصف یا اکثر حصہ انہیں اپنی گرہ سے چارا کھلائے تو یہ جانور علوفہ (گھر پر چارہ کھانے والے) شمار ہوں گے . کیونکہ قلیل اکثر کا تابع ہوتا ہے (یعنی سال کا کمتر حصہ بیشتر حصے کے تابع کیا جائے گا . لہذا ایسے جانوروں پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی) .

مسئلہ : زکاۃ وصول کرنے والے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مال میں سے اعلی اور عمدہ مال زکاۃ میں وصول کرے اور اور نہ ہی اُسے یہ اختیار ہے کہ وہ سب سے کمتر اور گھٹیا لے ، بلکہ وہ زکاۃ میں متوسط درجے کا جانور وصول کرے گا نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگوں کے اموال سے سب سے عمدہ اور اعلی مال نہ لیا کرو بلکہ ان سے متوسط درجے کا مال لیا کرو .

نیز اس (متوسط درجے کا مال وصول کرنے) میں دونوں طرفوں کا بھلا ہے . (اگر عمدہ لیا جائے تو مالک کا نقصان ہے اور اگر سب سے گھٹیا وصول کیا جائے تو بیت المال یا فقراء کا نقصان ہے ، مگر متوسط لینے میں جانبین کی رعایت مد نظر رہتی ہے) .

مسئلہ : اگر کسی شخص کے پاس ایک نصاب ہو اور سال کے دوران اس میں کچھ نیا مال آ جائے جو اسی جنس کا

ہو تو اسے پہلے مال کے ساتھ ہی شامل کیا جائے گا اور اس کی زکاۃ دی جائے گی .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس (نئے حاصل ہونے والے مال) کو شامل نہیں کیا جائے گا ، کیونکہ یہ حق ملکیۃ کے اعتبار سے پہلے مال سے الگ ہے . اس لیے اس کا وظیفہ یعنی حکم بھی الگ ہوگا . (یعنی سال کے دوران حاصل ہونے والا مال اصل کی حیثیۃ رکھتا ہے . وہ پہلے نصاب کے تابع نہیں . تاکہ پہلے کے ساتھ ملا کر اس کی زکاۃ بھی ساتھ ہی دی جائے . بلکہ مستفاد مال کا وظیفہ یعنی حکم بھی الگ ہوگا . جب اس پر سال پورا ہوگا تب زکاۃ واجب ہوگی) . البتہ جہاں تک مال تجارت اور جانوروں کے بچوں کا تعلق ہے اس کو پہلے مال کے ساتھ شامل کیا جائے گا . کیونکہ یہ نفع اور بچوں ملکیۃ میں اصل مال کے تابع ہیں ، حتی کہ نصاب کا مالک اصل مال پر حق ملکیۃ رکھتے ہوئے ضمنی طور پر اس کا بھی مالک ہو جائے گا . (لہذا مال تجارۃ کا نفع اور جانوروں کے بچوں کو اصل مال میں شامل کرکے پورے مال کی زکاۃ دی جائے گی) .

ہماری دلیل یہ ہے کہ ہم جنس ہونا ہی وہ علۃ ہے جس کی بناء پر اولاد اور نفع تجارۃ کو اصل مال کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے . (لہذا اگر کسی شخص کے پاس کوئی نصاب پہلے سے موجود ہے . اب ایسی ہی جنس خواہ اولاد ہو یا نفع تجارۃ ہو یا اسی مال کی نئی قسط ، تینوں صورتوں میں

اس کو اصل مال کے ساتھ شمار کیا جائے گا اور پورے مال کی زکاۃ ادا کی جائے گی) ۔

نیز اگر امام شافعیؒ کی بات مان لی جائے تو ہر نئے آنے والے مال کا امتیاز مشکل ہو جائے گا ، اور ہر مال کا حولان حول کا حساب رکھنا محال ہو جائے گا ۔ حالانکہ سال کی شرط جو زکاۃ کے سلسلے میں عائد کی گئی ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حساب کرنے میں سہولۃ ہو ۔

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک زکاۃ نصاب پر ہوگی اور عفو پر نہیں ہوگی ۔ امام محمدؒ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ دونوں پر واجب ہوگی کہ اگر عفو ضائع ہوگیا اور نصاب شرعی باق ہے تو شیخینؒ کے نزدیک پورا واجب باق ہے (یعنی اگر عفو ضائع نہ ہوتا تو جتنی زکاۃ ہوتی اتنی ہی اب بھی واجب ہوگی) ۔

امام محمدؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک بقدر نقصان زکاۃ ساقط ہو جائے گی ۔ (مثلاً ایک شخص کے پاس نو اونٹ ہیں ان میں سے اگر چار ہلاک ہوگئے تو امام صاحب اور ابو یوسفؒ کے ارشاد کے مطابق اس پر بکری ہی واجب ہوگی کیونکہ پانچ اونٹوں پر ایک بکری واجب ہے ۔ مگر امام محمدؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک بکری کا $\frac{5}{9}$ حصہ واجب ہوگا) ۔

امام محمدؒ اور امام زفرؒ کی دلیل یہ ہے کہ مال کی نعمۃ کے شکرانے کے طور پر زکاۃ واجب ہوئی ہے اور پورے کا پورا مال نعمۃ ہے ۔ (لہذا جس قدر مال ضائع ہوگیا اسی

قدر حصہ واجب کا بھی کم ہوگیا) .

امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ چراگاہ میں چرنے والے پانچ اونٹوں پر ایک بکری بطور زکاۃ واجب ہوگی اور زیادہ پر (یعنی عفو پر جو چھ سے نو تک ہے) کچھ واجب نہ ہوگا حتی کہ ان کی تعداد دس تک پہنچ جائے .

اسی طرح ہر نصاب کے متعلق یہی اصول ملحوظ رکھا جائے گا اور عفو پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی . کیونکہ عفو نصاب کے تابع ہے لہذا نقصان کو پہلے اس تابع کی طرف لوٹایا جائے گا . جیسا کہ مال تجارۃ میں جب کہ اس میں شراکۃ موجود ہو (تو نقصان کو پہلے نفع کی طرف لوٹایا جاتا ہے) [مثلا ا نے ب کو ایک ہزار روپیہ دیا کہ تم اس سے تجارۃ کرو ، نفع نصف نصف ہوگا . سال کے بعد ب نے چار سو روپیہ نفع کمایا . مگر اتفاق سے اسی دن ب سے دو صد روپے چوری ہوگئے تو اب دو صد کا نقصان رأس المال سے وضع نہیں کیا جائے گا بلکہ نفع سے منہا کیا جائے گا] . اسی بناء پر امام اعظمؒ کے نزدیک نقصان کو زیر بحث مسئلے میں پہلے عفو کی طرف لوٹایا جائے گا . اس کے بعد آئندہ نصاب کی طرف لوٹایا جائے گا یہاں تک کہ وہ نصاب انتہاء تک پہنچ جائے . کیونکہ اصل مال (جس پر زکاۃ واجب ہوئی ہے) وہ تو پہلا نصاب ہے اور جو اس سے زائد ہے وہ اس کے تابع ہے .

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نقصان کو پہلے عفو کی طرف

لوٹایا جائے گا اور اس کے بعد پورے نصاب کی طرف ۔ [مثلاً ایک شخص کے ۲۸ اونٹ ہیں ۔ ان پر ایک بنت مخاض واجب ہے ۔ اگر ان میں سے تین ہلاک ہوگئے تب بھی امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بنت مخاض ہی واجب ہوگی ۔ پھر ایک اور ہلاک ہوگیا اور چوبیس باقی رہ گئے تو بھی امام اعظمؒ کے نزدیک چار بکریاں ہوں گی ۔ مگر ابو یوسفؒ کے نزدیک بنت مخاض کی قیمت سے ۱/۵ حصہ کم ہو جائے گا ۔ اگر بیس باقی رہ جائیں تو امام اعظمؒ کے نزدیک چار بکریاں واجب ہوں گی ۔ مگر ابو یوسفؒ کے نزدیک بنت مخاض کا ۱/۵ حصہ کم ہو جائے گا ۔ حتی کہ اگر صرف پانچ باقی رہ جائیں تو امام اعظمؒ کے نزدیک ایک بکری ہوگی اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بنت مخاض سے ۳/۵ حصہ کم ہو جائے گا] ۔

مسئلہ : جب باغی اور سرکش لوگ مقبوضہ علاقے میں زمینوں کا خراج اور سوائم کی زکاۃ وصول کرلیں تو (امن بحال ہونے پر) لوگوں سے دوبارہ زکاۃ وصول نہیں کی جائے گی ۔ کیونکہ حاکم وقت نے ان کی حمایة و حفاظة کا فریضہ انجام نہیں دیا اور اسے یہ ٹیکس اسی صورة میں وصول کرنے کا حق ہوتا ہے جب کہ امام حفاظة کا فریضہ انجام دے ۔

بعض فقہاء کے نزدیک ان لوگوں کے بارے میں یہ فتوی دیا جائے گا کہ جہاں تک بندے اور اللہ تعالی کا تعلق ہے وہ دوبارہ زکاۃ ادا کر دیں ۔ یعنی حکومة کے پیش نظر زکاۃ

وبارہ نہ دیں سوائے اس کے کہ مفتی دوبارہ زکاۃ دینے کا
نوی دے کہ شاید پہلی زکاۃ اللہ تعالی کے ہاں کافی نہ ہو) .
خلاف خراج کے کہ خراج کا مصرف فوجی اور سپاہی ہوتے
ہیں اور خوارج بھی جنگی جماعت تو ہے (کہ انہوں نے
زور شمشیر اس علاقے پر قبضہ کیا ہے) ، مگر زکاۃ کا مصرف
فقراء ہیں . لہذا زکاۃ ان کو ادا نہیں کی جائے گی ، (مطلب یہ
کہ باغی زکاۃ کے مستحق نہیں) .

بعض فقہاء کے نزدیک اگر کسی شخص نے زکاۃ ادا
کرتے وقت مجبوراً صدقہ کی نیت کرلی تو اس سے زکاۃ ساقط
ہو جائے گی . اسی طرح ہر صدقہ جو کسی ظالم و غاصب کو
جبر کے تحت ادا کیا جائے (ادا ہو جائے گا) کیونکہ ان
(جبراً) وصول کرنے والوں پر لوگوں کے جو حقوق ہیں ،
اگر ان کا حساب کیا جائے تو یہ فقیر نکلیں گے . لیکن زیادہ
محتاط رائے وہی پہلی ہے .

مسئلہ : بنو تغلب کے بچوں پر ان کی چراگاہ میں چرنے
والے جانوروں پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی اور ان کی عورتوں
سے بھی وہی وصول کیا جائے گا جو ان کے مردوں سے
وصول کیا جائے گا ، کیونکہ مسلمانوں اور بنو تغلب کے
درمیان جو صلح ہوئی تھی اس میں طے یہ پایا تھا کہ جتنی
زکاۃ مسلمان مردوں سے وصول کی جاتی ہے اور جتنی مسلمان
عورتوں سے وصول کی جاتی ہے اس سے دگنی ان سے وصول
کی جائے گی اور ان کے بچوں سے کچھ نہیں لیا جائے گا .

مسئلہ : اگر زکاۃ واجب ہونے کے بعد مال ضائع ہو جائے تو اس مال کی زکاۃ ساقط ہو جائے گی ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس شخص میں زکاۃ واجب ہونے کے بعد اس کو ادا کرنے کی استطاعت تھی ، (اس کے بعد یہ مال ضائع ہوگیا) تو اس کی زکاۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی ۔ کیونکہ یہ اس کے ذمہ قرض کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ صدقۂ فطر کی طرح ہے ۔ (اگر کسی شخص نے عید کے دن صدقہ فطر ادا نہ کیا ،ور اس کا مال ضائع ہوگیا تو بھی صدقۂ فطر اس کے ذمے واجب ہوگا) ۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ جب اس سے زکاۃ کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے ادائیگی سے ہاتھ روک لیا ۔ لہذا اس کی نوعیۃ اس مال کی سی ہے کہ گویا اس نے اپنے ہاتھوں سے ضائع کر دیا ۔ (اگر کوئی شخص سال کے آخر تک ایک ہزار روپیہ موجود ہونے پر جب کہ زکاۃ اس پر واجب ہے اس مال کی زکاۃ ادا نہ کرے اور یہ ہزار روپیہ اپنی مرضی سے کسی فنڈ میں دے دے ، یا خرچ کر دے یا ضیافت میں اڑا دے تو ایسی صورۃ میں تمام ائمہ کے نزدیک اس مال کی زکاۃ اس کے ذمہ قرض ہوگی ۔ لیکن اگر یہ مال چوری ہو جائے ، ڈوب جائے یا کسی صورۃ میں ضائع ہوجائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک استہلاک کی حیثیت ہوگی ۔ لیکن احناف کے نزدیک مال کے خود ضائع ہونے کی صورۃ میں زکاۃ ساقط ہو جائے گی) ۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مال پر جو زکاۃ واجب ہو رہی ہے وہ اسی نصاب کا جزء ہے ۔ سہولۃ اور آسانی کا تحقق اسی میں ہے ، لہذا پورے مال کے ساتھ یہ جزء بھی ضائع ہو جائے گا۔ [یعنی شریعۃ اسلامیہ نے وجوب زکاۃ میں کئی سہولتیں اور آسانیاں مہیا کر رکھی ہیں ۔ مثلا نصاب تام ہو، اس پر سال گزر جائے ، مال نامی ہو ، مقروض نہ ہو وغیرہ وغیرہ ۔ اگر ہلاک شدہ مال پر بھی زکاۃ برقرار رکھی جائے تو یہ سہولۃ کی روح کے منافی ہے ، لہذا جب سارا مال ضائع ہوگیا تو زکاۃ والا جزء واجب بھی ساتھ ساقط ہی ہو جائے گا] ۔ جس طرح مجرم غلام کی جنایۃ میں ادائیگی اس کے مر جانے سے ساقط ہو جاتی ہے ۔ [مثلاً اگر کسی کا غلام جرم کر لے تو جن لوگوں کا یہ قصور وار ہے وہ اس غلام کے مالک سے اس کا مطالبہ کریں اور مالک اس غلام کو ان کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کرے ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ غلام سپرد کیا جائے تاکہ اس غلام کو سزا دی جائے ، یا اس سے بدلہ لیا جائے اتفاقاً وہ غلام ہلاک ہو جائے تو اب مالک کو اس جرم کی دیۃ دوبارہ ادا نہیں کرنی پڑے گی] ۔

لہذا اس مجرم غلام کی سپردگی کے مطابق جس طرح مالک کو دوبارہ تاوان ادا کرنے کی نوبۃ نہیں آتی اور تاوان ساقط ہو جاتا ہے ۔ اس طرح زکاۃ بھی پورا مال ضائع ہونے پر ساقط ہو جائے گی ۔

جہاں تک امام شافعیؒ کے اس اعتراض کا تعلق ہے کہ

اس سے زکاۃ کا مطالبہ کیا گیا ، لیکن اس نے ہاتھ روک لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مستحق وہ فقیر ہے جس کی تعیین مالک نصاب کرتا ہے ۔ (یعنی مالک نصاب جب زکاۃ ادا کرنے لگتا ہے تو فقیر کی تعیین کرتا ہے اور وہ فقیر مستحق بنتا ہے ۔ مگر جب اس نے (ادائیگی کی ہی نہیں تو فقیر نہ تو متعین ہوا اور نہ مستحق ہی بنا) لہذا فقیر کا مطالبہ کرنے والا بننا ثابت نہ ہوا ۔

البتہ اگر کسی عامل نے زکاۃ طلب کی (اور مالک نے ادا نہ کی) تو اس صورۃ میں بعض فقہاء نے کہا ہے کہ مالک زکاۃ کی ادائیگی کا ضامن ہوگا ۔ بعض کی رائے میں ضامن نہیں ہوگا ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس نے مال کو خود ضائع نہیں کیا۔

جہاں تک خود مال کو ضائع کرنے کا سوال ہے (مالک پر زکاۃ بہر طور واجب ہوگی ۔ کیونکہ اس میں مالک کی طرف سے) ظلم و تعدی کا پہلو پایا جاتا ہے ۔

اگر مال کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے تو اسی قدر اس کی زکاۃ بھی ساقط ہو جائے گی ۔ جس طرح کل مال ضائع ہونے سے کل زکاۃ ساقط ہو جاتی ہے ۔

مسئلہ : اگر کسی صاحب نصاب شخص نے سال گزرنے سے پہلے زکاۃ پیشگی ادا کر دی تو جائز ہوگی ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے وہ زکاۃ اس وقت ادا کی ہے جب اس کے واجب ہونے کا سبب موجود ہے ، لہذا یہ ادائیگی جائز ہوگی ۔ جس طرح کوئی شخص مہلک زخم کا کفارہ مجروح کے ہلاک

ہونے سے پہلے دے دے ۔ (یعنی زکاۃ میں دو چیزیں ہوں گی : سبب وجوب (یعنی نصاب) اور وجوبِ ادا (سال گزرنے کے بعد) اور مذکورہ بالا صورۃ میں ایک چیز یعنی سبب وجوب موجود ہے ۔ لہذا ادائیگی درست ہوگی جس طرح کوئی مجرم حرم میں جانور کو گولی مار کر زخمی کر دے اور یہ سمجھ کر کہ وہ یقیناً مر جائے گا اسی وقت کفارہ ادا کر دے تو درست ہوگا ۔ کیونکہ سبب وجوب یعنی گولی مار کر زخمی کرنا پایا جاتا ہے ۔ مگر وجوبِ ادا یعنی موت ، ابھی متحقق نہیں تھی ۔

اس میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے ان کے نزدیک زکاۃ کا پیشگی ادا کرنا جائز نہیں ۔ ایک سال سے زیادہ مدۃ کے لیے بھی زکاۃ پیشگی ادا کی جا سکتی ہے ۔ کیونکہ اس کے واجب ہونے کا سبب (یعنی نصاب) موجود ہے ۔ بہت سے نصابوں کی زکاۃ پیشگی ادا کرنا جب کہ وہ صرف ایک نصاب کا مالک ہو جائز ہے ۔

اس میں امام زفرؒ کو اختلاف ہے (وہ فرماتے ہیں کہ جس نصاب کا مالک ہے ۔ اس کی زکاۃ کا پیشگی ادا کرنا جائز ہے ، لیکن جو نصاب سرے سے اس کے پاس موجود ہی نہیں اس کی زکاۃ پیشگی کیونکر ادا کی جا سکتی ہے) ۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ پہلا نصاب ہی در حقیقت زکاۃ کے واجب ہونے کا سبب ہے اور اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور باقی زائد نصاب اس کے تابع ہوں گے ۔ (اگر کسی شخص کے پاس پانچ

سو روپیہ ہے اور اس پر زکاۃ فرض ہوگئی اور چند نصابوں
کی زکاۃ وہ پیشگی ادا کر دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا .
کیونکہ زکاۃ بہر حال اس پر فرض ہے جس کی پیشگی ادائیگی
وہ کر سکتا ہے . اب وہ یہ پیشگی بطور نقدی ادا کرے یا
اونٹ کی صورۃ میں یا گائے بھیڑ بکری کی صورۃ میں جائز
ہوگا) . واللہ أعلم بالصواب .

بَابُ زَكَاةِ الْمَالِ

مال کی زکاۃ کے بیان میں

فَصْلٌ فِی الْفِضَّۃِ

چاندی کی زکاۃ

مسئلہ : دو سو درہم سے کم چاندی پر زکاۃ واجب نہیں ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے ۔

مسئلہ : جب چاندی کی مقدار دو سو درہم کے برابر ہو جائے (یعنی ساڑھے باون تولے) اور ان پر ایک سال کی مدۃ گزر جائے تو اس پر پانچ درہم چاندی بطور زکاۃ واجب ہوگی ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذرض کو جو پیغام بھیجا وہ یہ تھا کہ ہر دو سو درہم پر پانچ درہم زکاۃ وصول کی جائے اور بیس مثقال سونے پر نصف مثقال سونا زکاۃ کے طور پر وصول کیا جائے ۔

مسئلہ : اس مقررہ نصاب کے بعد جو مال زائد ہو اگر اس کی مقدار چالیس درہم تک پہنچ جائے تو اس پر ایک درہم زکاۃ کے طور پر واجب ہوگا . اگر مقدار چالیس درہم سے کم ہو تو کچھ واجب نہ ہوگا اور اسی طرح ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکاۃ واجب ہوتی چلی جائے گی . یہ امام اعظمؒ کا مسلک ہے ، صاحبینؒ کہتے ہیں : دو سو (۲۰۰ درہم سے جتنا مال زائد ہو جائے اس زیادتی پر اسی حساب سے (یعنی ۱/۴۰ کے حساب سے زکاۃ وصول کی جائے گی . امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے . ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد حضرت علیؓ سے منقول روایت میں موجود ہے : وَمَا زَادَ عَلَى الْمِائَتَيْنِ فَبِحِسَابِهِ یعنی دو سو پر جس قدر زیادہ ہو اس حساب سے زکاۃ دی جائے گی .

دوسری دلیل یہ ہے کہ زکاۃ اس لیے واجب ہوئی ہے کہ اللہ تعالی کے دیے ہوئے مال کی نعمۃ کا شکر ادا کیا جائے . (اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب زکاۃ شکران نعمت کے طور پر واجب ہے تو پھر نصاب مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی . کیا دو سو سے کم درہم اللہ تعالی کی نعمۃ نہیں ؟ یا چھ سے نو تک اونٹ اللہ تعالی کی نعمۃ نہیں ؟ امام شافعیؒ جواب میں فرماتے ہیں) . کہ نصاب کو آغاز کار میں مقرر کر دینے کی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے تاکہ مال دار ہونا ثابت ہو جائے . (امام شافعیؒ پر پھر سوال کیا گیا کہ تحقق غناء کے لیے تو ابتداء میں نصاب کی شرط لگائی گئی مگر

سوائم میں انتہاء میں کیوں شرط لگائی گئی کہ پانچ اونٹ ہونے پر ایک بکری واجب ہے۔ مگر چھ سے نو تک میں بھی ایک ہی بکری ہے۔

جب اونٹ پانچ سے بڑھ جائیں تو غناء میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نصاب کے بعد سوائم میں یہ اصول اس لیے عائد نہیں کیا کہ ٹکڑے کرنے سے گریز کیا جائے۔ کیونکہ کسی جانور کا کچھ حصہ الگ کرکے زکاۃ میں دینا ناممکن ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذؓ سے منقول حدیث میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ کسروں پر کوئی شیء زکاۃ کے طور پر وصول نہ کرو۔ نیز آپ کا ایک اور ارشاد عمرو بن حزم کی روایت میں موجود ہے کہ چالیس سے کم میں زکاۃ واجب نہیں۔

اس کی عقلی توجیہ یہ ہے کہ کسروں پر زکاۃ واجب کرنے میں تنگی واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ حساب کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور حرج و تنگی شریعۃ کے نزدیک مذموم ہے۔ (خیال فرمائیں دو سو درہم پر زکاۃ واجب ہے، اگر کسور پر بھی واجب کریں تو کس قدر مشکل ہو۔ مثلاً دوسرے دن چار درہم زیادہ ہو جائیں۔ چوتھے دن ساڑھے پانچ کا اضافہ ہو اور پانچویں دن سوا سات درہم بڑھ جائیں۔ اسی طرح کسور کا حساب ایک لا ینحل الجھن میں ڈال دے گا)۔

مسئلہ : دراھم میں وزن کا اعتبار اس لحاظ سے کیا

جائے گا کہ دس درہم ، وزن میں سات مثقال کے برابر ہیں ۔ (ایک مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے ۔ چنانچہ ایک سو چالیس مثقالوں یا دو سو دراہم کا وزن ساڑھے باون تولے ہوگا) ۔ یہی وہ اندازہ ہے جو حضرت عمرؓ کے دیوان مالیات میں جاری رہا اور اسی پر آج تک عمل ہوتا چلا آیا ہے ۔

مسئلہ : جب چاندی کے پترے میں چاندی غالب ہو تو اس پر چاندی ہی کا اطلاق ہوگا اور جب اس پر کھوٹ غالب ہو تو اس کو سامان تجارۃ یا دوسرے ساز و سامان میں شمار کیا جائے گا ۔ لیکن اس کا اعتبار اس وقت کیا جائے گا جب اس کی قیمت نصاب کی حد کو پہنچ جائے کیونکہ کوئی درہم بھی تھوڑے سے کھوٹ سے خالی نہیں ہوتا اور بغیر کھوٹ کے چاندی پر ٹھپہ یا نقش و نگار یا تحریر ممکن نہیں ۔ لیکن (نصف سے زیادہ) سے خالی ہونا ممکن ہے ۔ لہذا ہم نے چاندی کے نصف سے غالب ہونے کو چاندی کا حد فاصل ٹھیرایا اور وہ یہ ہے کہ چاندی حقیقی معنی میں نصف سے زیادہ ہو ۔ اس کا بیان بیع صرف میں تفصیل سے آئے گا ۔

البتہ اگر کھوٹ غالب ہو تو اس پر زکاۃ اسی صورۃ میں ہوگی ، جب تجارۃ کی نیت ہو جس طرح کہ دوسرے سامان میں نیت کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔

اگر چاندی کو کھوٹ سے الگ کرنا ممکن ہو اور چاندی کی مقدار نصاب تک پہنچ جائے (تو اس پر زکاۃ واجب ہوگی) ۔ کیونکہ جب خالص چاندی ہو تو اس صورۃ میں نہ

تو چاندی کی قیمت کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ تجارۃ کی نیت کا۔ (خالص چاندی میں صرف وزن کا لحاظ ہوتا ہے۔ جب چاندی کا وزن ساڑھے باون تولے ہو جائے تو اس پر زکاۃ واجب ہوگی)۔

واللہ أعلم بالصواب

فصل فی الذّھَب

سونے کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : سونے کی مقدار اگر بیس مثقال (۷½) تولے سے کم ہو تو اس پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی ۔

مسئلہ : جب (سونے کی) مقدار بیس مثقال ہو جائے تو اس پر نصف مثقال بطور زکاۃ واجب ہوگا اور مثقال کا اندازہ یہ ہے کہ دس درہم کا وزن سات مثقال کے برابر ہوتا ہے ۔ (پاکستانی اوزان کے مطابق ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے) اور یہی وزن مروج رہا ہے ۔

مسئلہ : (ساڑھے سات تولے سونا موجود ہونے کے بعد) اگر چار مثقال سونا کسی شخص کے پاس موجود ہو تو اس پر قیراط زکاۃ واجب ہوگی ۔ کیونکہ مال پر کل کا ۱/۴۰ حصہ واجب ہوتا ہے اور اسے ہم پہلے بھی تفصیل سے بیان کرچکے ہیں ۔ کیونکہ ایک مثقال میں بیس قیراط ہوتے ہیں (اور چار مثقال کا ۱/۴۰ حصہ دو قیراط ہوں گے ۔

مسئلہ : امام اعظمؒ کے نزدیک چار مثقال سے کم مقدار سونے میں زکاۃ واجب نہیں ہوگی ۔

صاحبین؁ کے نزدیک ۱/۴۰ کے حساب سے زکاۃ واجب ہوگی اور یہ کسروں میں زکاۃ وصول کرنے کا مسئلہ ہے (جو پچھلے باب میں تفصیلاً بیان ہو چکا ہے) .

مسئلہ : ایک دینار کی قیمۃ شریعۃ اسلامیہ میں دس درھم مانی گئی ہے لہذا چار مثقال میں چالیس درھم ہو جائیں گے . (چاندی کی زکاۃ کے بیان میں یہ بحث کی جا چکی ہے کہ امام اعظم؁ کے نزدیک جب چاندی کی مقدار چالیس درہم تک پہنچ جائے تو اس صورۃ میں ایک درہم بطور زکاۃ واجب ہوگا . صاحبین؁ اور امام شافعی؁ فرماتے ہیں کہ اس سے کم پر بھی زکاۃ اسی حساب سے واجب ہوگی مثلاً بیس درہم پر نصف درہم واجب ہوگا) .

مسئلہ : سونے کی ڈلی ہو یا چاندی کی ، یا ان سے بنا ہوا زیور ہو یا برتن ان سب پر زکاۃ واجب ہوگی . امام شافعی؁ فرماتے ہیں کہ عورتوں کے زیور پر (خواہ وہ سونے کا ہو یا چاندی کا) اور مردوں کی اس انگوٹھی پر جو چاندی سے بنائی گئی ہو زکاۃ واجب نہیں ہوگی . کیونکہ سونے اور چاندی کا یہ استعمال دونوں کے لیے مباح ہے . لہذا اس کی مثال استعمال کے کپڑوں کی سی ہے .

احناف کی دلیل یہ ہے کہ زکاۃ کے واجب ہونے کا اصل سبب اس کا مال نامی ہونا ہے اور یہ مال نامی ہے . کیونکہ اس میں بڑھنے کی استعداد موجود ہے اور یہ کہ سونا اور چاندی اپنی پیدائش کے اعتبار سے تجارۃ کے لیے ہیں ،

اس کو استعمال کے کپڑوں پر قیاس کرنے کی بجائے یہ دلیل زیادہ معتبر ہے ۔ (شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغۃ میں زکاۃ کے باب میں اس مسئلہ پر ائمۃ کا اختلاف بیان کرتے ہوئے اپنی رائے یہ دیتے ہیں کہ احتیاط کا تقضا یہ ہے کہ زیورات کی زکاۃ ادا کی جائے اور حدیث کی روشنی میں ایک عورت کا کنگن پہنے ہوئے آنحضرت ﷺ کے پاس آنا اور آپ کا اسے ان کنگنوں کی زکۃ ادا کرنے کا حکم دینا اس بات پر دلالۃ کرتا ہے کہ زیورات کی زکاۃ دی جائے) ۔

فَصْلٌ فی الْعُرُوض

مال تجارت کی زکاۃ کے بیان میں

مسئلہ : سامان تجارۃ خواہ اس کی مقدار یا اس کی نوعیۃ کچھ ہی ہو ۔ جب اس کی قیمت سونے اور چاندی کے لحاظ سے شرعی نصاب کو پہنچ جائے تو اس پر زکاۃ واجب ہوگی کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ اپنے مال تجارۃ کا اندازہ کرے اور دو سو درہم پر پانچ درہم بطور زکاۃ ادا کرے ۔

اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ مال اس امر کے لیے تیار کیا گیا ہے ۔ کہ اس میں اضافہ ہو اور انسان اسے اسی مقصد کے لیے تیار کرتا ہے ۔ لہذا یہ (مال تجارۃ) شریعۃ کے تیار کردہ مال کے مشابہ ہوگا اور اس میں تجارۃ کی نیت شرط ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی اس نے یہ مال تجارۃ کے لیے تیار کیا تھا ۔ (اعداد یعنی مال کی تیاری دو قسم کی ہوتی ہے : اعداد من الشرعؒ یعنی جس مال کو شریعۃ نے تیار کیا ہے ، یہ مال سونا اور چاندی ہے اور اس میں قدرۃً نما موجود ہے ، لہذا اس کی زکاۃ میں نیت شرط نہیں ۔ دوسرا

اعداد من جہۃ العباد ہے جیسا کہ دوسرے ساز و سامان ہیں لوگ ان کی تیاری تجارۃ و نما کے لیے کرتے ہیں اس لیے نیت کی شرط عائد کی گئی]۔

مسئلہ: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ سامان تجارۃ کی قیمت کا اندازہ ایسے طور پر کرے جو مساکین کے لیے زیادہ سود مند ہو تاکہ فقراء کے حق کا لحاظ رکھا جائے اور احتیاط اسی میں ہے۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایۃ امام اعظمؒ سے منقول ہے (یعنی امام اعظمؒ کے نزدیک نصاب کے مالک کو اپنے سامان کا اندازہ سونے اور چاندی میں اس نصاب سے کرنا چاہیے جس سے تنگ دستوں کو زیادہ فائدہ ہو)، لیکن امام محمدؒ نے مبسوط میں مالک کو اختیار دیا ہے (کہ وہ سونے اور چاندی میں سے جس سے بھی چاہے نصاب کا اندازہ کر سکتا ہے، کیونکہ سونا اور چاندی دونوں قیمتوں کا اندازہ کرنے میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور زیادہ نفع رساں ہونے سے یہ مراد ہے کہ مال کی قیمت کا اندازہ اس طریق سے لگایا جائے کہ نصاب تک پہنچ جائے)۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مالک اپنے مال کا اندازہ اس چیز سے کرے جس سے اس نے (مال) خریدا ہے، سونے اور چاندی سے خرید کیا ہے یا نقد روپیہ سے کیونکہ مال کی مالیت جاننے میں ان تینوں سے قیمت کا اندازہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اگر تینوں کے علاوہ کسی اور چیز سے

اس نے خریداری کی ہے تو مال کی قیمت کا اندازہ مروج سکے سے کر لے ۔ (نقد خالص سے مراد سونے چاندی اور روپیہ میں سے وہ چیز ہے جو عام طور پر چیزوں کے اندازہ کرنے میں مروّج ہے ، جیسے پاکستان میں روپیہ) ۔

امام محمدؒ سے روایت ہے کہ تمام حالات میں نقد غالب ہی سے قیمت کا اندازہ لگایا جائے. (یہ رائے زیادہ مناسب ہے) امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا مال چھین لیا جائے یا ضائع کر دیا جائے تو اس کی قیمت کا اندازہ ہمیشہ نقد غالب سے لگایا جاتا ہے ۔ (اسی طرح مال تجارۃ میں بھی قیمت کا اندازہ نقد غالب ہی سے لگانا چاہیے) ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص کے پاس آغاز سال اور انتہاء سال میں پورا نصاب موجود ہو اور سال کے درمیان میں اس نصاب میں کچھ کمی واقع ہو جائے تو زکاۃ ساقط نہیں ہوگی ۔ کیونکہ سارے سال میں نصاب کا کامل طور پر رکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے ۔ البتہ آغاز سال میں نصاب کے کامل ہونے کو ملحوظ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ نصاب کا انعقاد ہو سکے، اور مالک کا غنی ہونا ثابت ہو جائے اور سال کے آخر میں نصاب کا پورا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ زکاۃ کو واجب کیا جا سکے. لیکن دوران سال میں یہ پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ مال کے باقی رہنے کی حالت ہے ۔ (یعنی سال کے دوران کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہے ۔کامل نصاب باقی رہنا ضروری نہیں)۔

البتہ اگر پورے کا پورا مال ضائع ہو جائے (تو اس

صورة میں سال کے آخر میں نصاب اگر کامل بھی ہو تو زکاة واجب نہیں رہے گی) کیونکہ سال کے گزرنے کی شرط باطل ہو چکی ہے اور نصاب چونکہ پورے طور پر ضائع ہوگیا ہے لہذا زکاة واجب نہ ہوگی . لیکن پہلی صورة میں یہ حکم نہیں ہوگا . کیونکہ نصاب کا کچھ نہ کچھ باقی ہے . لہذا سال کے اول اور آخر میں نصاب کے کامل ہونے کی اور دوران سال نصاب کا کچھ حصہ باقی رہنے کی صورة میں زکاة واجب ہوگی .

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ سامان تجارة کی قیمت کو سونے اور چاندی کے ساتھ ملایا جائے گا تاکہ نصاب پورا ہو جائے ، کیونکہ سامان تجارة پر زکاة اس لیے واجب ہے کہ اسے تجارة کے لیے تیار کیا گیا ہے (اور سونا اور چاندی اپنی فطرة یا پیدائش کے اعتبار سے مال تجارة شمار ہوتے ہیں . لہذا کسی سامان میں جب تجارة کی نیت کر لی جائے تو مالک کی نیت سے سامان تجارة قرار پائے گا . لیکن سونا اور چاندی چونکہ طبعی اعتبار سے مال تجارة ہے اور شریعة اسے نیت کے بغیر بھی مال تجارة ہی گردانتی ہے) . (**وَإِنِ افْتَرَقَتْ جِهَةُ الْأَعْدَادِ** - یعنی اگرچہ جہة اعداد میں مختلف ہیں . کیونکہ سامان تجارة کا اعداد من جہة العباد ہوتا ہے اور سونے چاندی کا اعداد من جہة الشرع ہے) .

مسئلہ : سونے کو چاندی کے ساتھ ملایا جائے گا . (یعنی سونے کو چاندی کے ساتھ شامل کرنے سے اگر ان کی

مجموعی قیمت یا مقدار نصاب کے برابر ہو تو زکاۃ واجب ہوگی) . کیونکہ اشیاء کی قیمتوں کا معیار ہونے کے اعتبار سے ہم جنس ہیں اور اس لحاظ سے ان کی مجموعی قیمت یا مقدار کا نصاب تک پہنچ جانا ان پر زکاۃ واجب ہونے کا سبب قرار پائے گا .

امام اعظمؒ کے نزدیک ان کو قیمت کے لحاظ سے ملایا جائے گا اور صاحبینؒ کے نزدیک ان کو اجزاء یا مقدار کے حساب سے ملایا جائے گا . اسی قسم کی ایک روایة امام اعظمؒ سے مروی ہے . حتی کہ اگر ایک شخص کے پاس ایک سو درہم چاندی اور پانچ مثقال سونا اور پانچ مثقال سونے کی قیمت ایک سو درہم ہو تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس پر زکاۃ واجب ہوگی اور صاحبینؒ عدم وجوب کے قائل ہیں . صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ سونے اور چاندی میں زکاۃ کا واجب ہونا وزن کے اعتبار سے ہے قیمت کے لحاظ سے نہیں . حتی کہ ایک ایسا زیور یا برتن جو چاندی کا ہو اور اس کا وزن دو سو درہم سے کم ہو اور قیمت دو سو درہم سے زیادہ ہو تو اس پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی .

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اُن کا ملانا ہم جنس ہونے کے اعتبار سے ہے اور ان کا یہ ہم جنس ہونا قیمت سے ثابت ہے صورۃ سے نہیں لہذا قیمت کے لحاظ سے ان کو ملایا جائے گا . واللہ أعلم بالصواب .

بَابٌ مَنْ يَمُرُّ عَلَى الْعَاشِرِ

اس شخص کے بارے میں جو محصول وصول کرنے والے کے پاس سے گزرتا ہے

مسئلہ : جب کوئی تاجر اپنا مال لے کر عاشر کے پاس سے گزرے اور یوں کہے کہ یہ مال مجھے چند مہینوں سے حاصل ہوا ہے یا مجھ پر قرض ہے اور اس نے قسم کھائی تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔

عاشر وہ ہے جس کو حاکم وقت کسی شارع عام پر مقرر کرے تاکہ وہ سوداگروں یا تاجروں سے صدقات وصول کرے۔ پس جس تاجر نے سال پورا ہونے یا مال کے قرض سے فارغ ہونے سے انکار کیا تو اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوگی جس پر کچھ چیز واجب ہو اور وہ اس کے واجب ہونے سے انکار کرے، اور شریعة اسلامیہ میں منکر کا قول قسم کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے (یعنی جب اس نے اس بات سے انکار کیا کہ مال پر سال کی مدة نہیں گزری یا مال قرض سے فارغ نہیں ہے تو ایسی صورة میں اس نے گویا زکاة کے واجب ہونے سے انکار کیا۔ لہذا اس سے قسم لی جائے گی اور زکاة

اسے سے بری الذمہ قرار دیا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ اس نے جھوٹی قسم کھائی تو عنداللہ گناہگار ہوگا)۔

مسئلہ : مسئلے کا حکم یہی رہے گا۔ اگر تاجر یہ کہے کہ میں نے اس مال کا ٹیکس کسی دوسرے عاشر کو دے دیا ہے (اس صورۃ میں بھی اس سے ٹیکس نہیں لیا جائے گا) بشرطیکہ اس سال حکومت نے دوسرا عاشر مقرر کیا ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس شخص نے یہ دعوی کیا کہ اس نے امانت کو اس کے مستحق کے پاس پہنچا دیا ہے۔ البتہ اگر اس سال میں کوئی دوسرا عاشر مقرر ہی نہ ہو (تو ایسی صورۃ میں اس کے حلف کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اس سے عشور وصول کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی دروغ بیانی اور اس کا جھوٹ یقینی طور پر ظاہر ہوگیا ہے۔

مسئلہ : اگر تاجر یہ کہے کہ میں نے اس مال کی زکاۃ اپنے شہر کے فقراء کو خود ادا کر دی ہے (تب بھی اس کی بات مان لی جائے گی) اور وہی حکم رہے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مال کی زکاۃ کی ادائیگی اس شخص کے سپرد تھی (جب کہ یہ مال اموال باطنہ میں سے ہو۔ اموال باطنہ سے مراد سونا، چاندی، نقد اور مال تجارۃ ہے)۔ اور سلطان کا ان صدقات کو وصول کرنے کا حق اسی بناء پر ہے کہ وہ اس کی حفاظۃ و حمایۃ میں اپنا سفر طے کرنے کے لیے داخل ہے۔ (اگرچہ یہ تاجر تحت الحمایۃ تو ہے مگر حق واجب اپنے شہر میں ادا کر چکا ہے، لہذا دوبارہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا)۔

مسئلہ : اگر کوئی تاجر سوائم لے کر گزرے تو
مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں مسئلے کا حکم یہی رہے گا .
(اس سے قسم لے کر زکاة وصول نہیں کی جائے گی). لیکن چوتھی
صورة میں جب تاجر یہ کہے کہ میں نے سوائم کی زکاة اپنے
شہر کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی ہے تو اس کی
تصدیق نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ قسم بھی کھائے .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس صورة میں بھی تاجر کی
تصدیق اس بناء پر کی جائے گی کہ اس تاجر نے حق (زکاة)
مستحق (غرباء و مساکین) تک پہنچا دیا .

ہماری دلیل یہ ہے کہ سوائم کی زکاة وصول کرنے کا
حق سلطان وقت کو ہے . لہذا مالک نصاب اس حق کو باطل
کرنے کا اختیار نہیں رکھتا . بخلاف اموال باطنہ کے (کہ ان
کی زکاة مالک خود ادا کر سکتا ہے) .

چوتھی صورة کے سلسلہ میں جب کہ زکاة دینے والا
سوائم کی زکاة اپنے شہر میں ادا کر چکا ہو اور پھر عاشر
بھی اس سے لےلے ، تو اس صورة میں کون سی ادائیگی زکاة
کے طور پر شمار ہوگی) . بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ حقیقی
زکاة وہ ہے جو وہ اپنے شہر میں ادا کر چکا ہے اور دوسری
بار جو اس نے عاشر کو ادا کی ہے وہ سیاسة یعنی ملکی قانون
کی بناء پر ہے .

بعض فقہاء یہ کہتے ہیں کہ زکاة دراصل وہ ہے جو
اس نے دوسری بار عاشر کو ادا کی ہے اور پہلی زکاة جو

اس نے اپنے شہر میں ادا کی تھی وہ نفل شمار ہوگی اور یہی رائے صحیح ہے۔

سوائم اور مال تجارۃ کی مذکورہ بالا صورتوں میں (تاجر کی تصدیق کے سلسلے میں امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں رسید کا پیش کرنا اور دکھانا شرط قرار نہیں دیا۔ مبسوط میں اسے شرط قرار دیا ہے اور امام اعظمؒ سے امام حسنؒ نے یہی روایۃ بیان کی ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ تاجر نے ایک دعوی کیا (کہ وہ عُشر ادا کر چکا ہے) اور اس کے پاس ثبوت کے طور پر ایک علامۃ اور نشان ہے تو اس کا دکھانا اس پر واجب ہوگا۔

پہلی صورۃ کی دلیل (جس میں رسید دکھانے کا اعتبار نہیں صرف حلف لینا کافی ہوگا) یہ ہے کہ ایک خط دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے۔ لہذا اس کو علامۃ قرار نہیں دیا جائے گا۔

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں وہ تمام مسائل میں جن میں ایک مسلمان کی تصدیق کی جاتی ہے، ان میں ذمی کی بھی تصدیق کی جائے گی۔ کیونکہ ایک ذمی سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ اس رقم سے دگنا ہوتا ہے جو مسلمان سے وصول کرنے کے لحاظ سے مسلمان کی سی شرائط پیش نظر رکھی جائیں گی۔

مسئلہ : ایک حربی کی مذکورہ بالا صورتوں میں تصدیق نہیں کی جائے گی۔ البتہ اگر اس کے پاس کچھ لونڈیاں ہوں

اور وہ کہے کہ یہ میری اُم ولد ہیں یا اس کے ساتھ کچھ لڑکے ہوں اور وہ کہے کہ یہ میری اولاد ہیں تو (اس صورۃ میں ان باندیوں اور لڑکوں پر اس سے کچھ وصول نہیں کیا جائے گا) . اس کی دلیل یہ ہے کہ حربی سے ٹیکس وصول کرنا حمایۃ کی بناء پر تھا اور اس کے پاس جو مال ہے وہ حفاظۃ کا محتاج ہے . لیکن اگر وہ لڑکوں کے متعلق یہ اقرار کر لے کہ وہ اس کے نسب سے ہیں ، تو اس کا کہنا صحیح ہوگا . اسی طرح اُم ولد کے بارے میں بھی اس کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا ، کیونکہ اُم ولد کی بنیاد بھی اسی کے نسب سے ہے . لہذا ان باندیوں میں مالیۃ کی صفت معدوم ہوگی اور عُشر یا ٹیکس اسی صورۃ میں قابل وصول ہوتا ہے جب اس کے پاس مال ہو .

مسئلہ : ایک مسلمان سے ۱/۴۰ حصہ لیا جائے گا ، ذمی سے ۱/۲۰ اور حربی سے ۱/۱۰ حصہ وصول کیا جائے گا . حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو یہی فرمان ارسال کیا تھا .

مسئلہ : اگر کوئی حربی پچاس درہم لے کر (یا پچاس درہم کی مالیت کا مال لے کر) کسی عاشر کے پاس سے گزرے تو اس سے کچھ نہیں لیا جائے گا . اگر حربی لوگ ہم سے اتنی رقم پر کچھ وصول کرتے ہوں تو ہم بھی اتنی ہی مقدار میں ان سے وصول کریں گے . (ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر وہ وصول کرتے ہیں تو ہم ان سے اتنی ہی مقدار پر کچھ وصول نہ کریں) لیکن یہ ادلے کا بدلہ ہے .

رہا مسلمان اور ذمی سے وصول نہ کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان سے وصول شدہ رقم زکاۃ ہے اور ذمی سے وصول شدہ اس زکاۃ کا دگنا ہے. لہذا اس صورۃ میں نصاب کا تعین ضروری ہے اور مسئلہ کی یہ صورۃ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں بیان کی ہے.

لیکن کتاب الزکاۃ میں ہے کہ اس قدر قلیل رقم پر ہم حربی سے بھی کچھ نہیں لیں گے. خواہ وہ لوگ ہم سے وصول ہی کیوں نہ کرتے ہوں. کیونکہ اتنی قلیل رقم ٹیکس سے مستثنٰی ہے. نیز اتنی رقم کی حفاظۃ کی (سرکاری طور پر) چنداں ضرورۃ پیش نہیں آتی.

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حربی دو سو درہم (یا دو سو درہم کی مالیۃ کا مال) لے کر عاشر کے پاس سے گزرے اور عاشر کو اس بات کا علم نہ ہو کہ حربی لوگ مسلمان تاجروں سے کیا وصول کرتے ہیں، تو ہم حربی سے عُشر وصول کریں گے. اس کی دلیل حضرت عمرؓ کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر تمہیں اس بارے میں کوئی آگاہی حاصل نہ ہو تو ان سے $\frac{1}{10}$ حصہ لیا جائے۔

اگر عاشر کو اس بات کا علم ہو کہ حربی لوگ ہم سے $\frac{1}{20}$ حصہ لیتے ہیں یا $\frac{1}{40}$ حصہ وصول کرتے ہیں، تو ہم بھی اسی قدر وصول کریں گے لیکن اگر پورے کا پورا ہی لے لیتے ہوں تو ہم پورا نہیں لیں گے، کیونکہ یہ ظلم اور زیادتی ہے. (غدر کے معنی بے وفائی اور عہد شکنی کے ہیں. جب ایک

حربی امان لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو اور ہم اس سے پورا مال لے لیں تو یہ اس پر ظلم اور زیادتی کے مترادف ہے. اگر وہ لوگ ہم سے ناروا سلوک کریں تو کم از کم ہمیں اسلامی اور اخلاقی قدروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا ان سے نہیں کرنا چاہیے ، بلکہ کچھ حصہ ان کے پاس رہنے دیا جائے جو ان کے لیے زاد راہ ہو) .

مسئلہ : اگر وہ لوگ مسلمانوں سے کچھ بھی نہیں لیتے تو ہم بھی ان سے کچھ نہیں لیں گے تاکہ وہ ہمارے تاجروں سے آئندہ بھی کچھ وصول نہ کریں . نیز محاسن اخلاق کی پابندی ہم پر غیر مسلموں سے زیادہ عائد ہوتی ہے .

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں اگر کوئی حربی کسی عاشر کے پاس سے گزرے اور عاشر اس سے عشر وصول کرلے، اس کے بعد پھر گزرے تو دوسری بار اس سے عشر وصول نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ ایک سال نہ بیت جائے. اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس سے ہر بار عشر وصول کرنا اس کے مال کو ہلاک اور ضائع کرنے کے مترادف ہے اور عُشر کے وصول کرنے کا حق اس بناء پر تھا کہ مال کی حفاظت کی جائے (چہ جائے کہ بار بار وصول کرنے سے اس کے مال کو ضائع کر دیا جائے) . اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ پناہ اور امان کا وہ حکم جو اسلامی سلطنۃ کی سرحد پر داخل ہوتے ہوئے ان کو دیا گیا تھا ابھی باقی ہے . ہاں سال گزرنے پر اس امان یا پناہ کی تجدید ہو جایا کرتی ہے . کیونکہ حربی کو ایک سال سے

زیادہ اقامت کی اجازۃ نہیں دی جاتی (کہ اسلامی ملک میں وہ فتنہ و فساد بپا نہ کرتا رہے ۔ آج کل بھی کوئی شخص اگر پاسپورٹ یا ویزا لے کر کسی ملک میں جائے تو ظاہر ہے کہ ہر سال ویزا کی تجدید ضروری ہوتی ہے) ۔ ایک سال کے بعد اس سے عشر وصول کر لیا جائے تو اس سے مال ضائع نہیں ہوتا ۔ (کیونکہ ایک سال تک کسی غیر ملکی کا اسلامی سلطنۃ میں رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے ، جس کی بناء پر وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں مقیم ہے ۔ لہذا ایسی صورۃ میں جب کہ وہ یہاں سے نفع حاصل کرتا رہا ہے ، سال گزرنے پر اس سے دوبارہ عشر وصول کرنا اس کے مال کو ہلاک کرنا قرار نہیں دیا جائے گا ۔ نیز سال گزرنے کے بعد ایک مسلمان بھی تو زکاۃ ادا کرتا ہے اور ذمی سے زکاۃ سے دوگنا وصول ہوتا ہے ۔ لہذا حربی سے بھی اگر سال کی مدۃ گزرنے پر عشر وصول کر لیا جائے تو یہ اس پر ظلم اور زیادتی شمار نہ ہوگا) ۔

مسئلہ : اگر کسی حربی سے عاشر نے عُشر وصول کرلیا اور حربی بعد میں دارالحرب میں لوٹ گیا اور اسی روز پھر دوبارہ سلطنۃ اسلامیہ میں داخل ہوا تو اس سے از سر نو عُشر وصول کیا جائے گا کہ وہ از سر نو امان لے کر داخل ہوا ہے ۔ اس نئے مال میں سے عشر وصول کرنا اس کے مال کو ضائع کرنا شمار نہیں ہوگا (حربی دوبارہ داخل ہی اس لیے ہوا ہے کہ اسے معلوم تھا کہ اتنا ٹیکس دینے کے باوجود

اس کو فائدہ رہے گا ۔ اسی لیے تو وہ اس نئے مال کو جو اپنے گور سے لا رہا ہے نئی امان لے کر داخل ہو رہا ہے ، اس لیے اس سے از سر نو مال پر ٹیکس لیا جائے گا) ۔

مسئلہ : اگر کوئی ذمی شراب اور خنزیز لے کر عاشر کے پاس سے گزرے تو عاشر اس سے شراب کا عُشر وصول کرے گا لیکن خنزیر کا عُشر وصول نہیں کرے گا ۔

مصنفؒ کا یہ قول **عَشَّرَ الْخَمر** کہ وہ شراب کا عُشر دے اس سے عین شراب مراد نہیں بلکہ اس کی قیمت ہے ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کا عشر نہیں لیا جائے گا ۔ کیونکہ شریعۃ اسلامیہ میں ان دونوں کی کوئی قیمت نہیں ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کا عُشر لیا جائے گا ۔ کیونکہ مالیۃ ہونے میں ذمیوں کے نزدیک یہ دونوں مساوی ہیں ۔

امام ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ جب ذمی ان دونوں کو اکھٹا لے کر گزرے تو عاشر دونوں کا عشر وصول کرے گا ۔ گویا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے میں خنزیر شراب کے تابع شمار ہوگا ۔

اگر ذمی ان دونوں کو الگ الگ لے کر گزرے تو عاشر شراب کا عُشر وصول کرے ، لیکن خنزیر کا نہیں ۔ ظاہر الروایۃ کے مطابق فرق کی وجہ یہ ہے کہ قیمۃ ذواۃ القیم میں سے ہے ۔ اس کا حکم عین ہے اور خنزیر ذوات القیم میں

سے ہے اور ذوات الأمثال میں یہ حکم نہیں اور شراب ذاوت الأمثال میں سے ہے .

اموال کی دو قسمیں ہیں ذوات القیم اور ذوات الأمثال . ذوات الأمثال وہ ہیں جن اموال کی مثال مل سکے . جیسے گندم، کپڑا اور سونا چاندی وغیرہ . اگر کوئی شخص کسی کی گندم ضائع کر دے تو اسی قسم کی گندم اسے مل سکتی ہے . ذوات القیم وہ ہیں جن کا عین نہ مل سکے مثلاً کسی غلام کو کوئی شخص قتل کر دے ، تو اس کی قیمة دینا ہوگی . کیونکہ اس جیسا غلام تمام دنیا میں دستیاب نہیں ہو سکتا . اس طرح جانور بھی ذوات القیم میں شمار ہوتے ہیں . علم اصول کا یہ قانون ہے کہ ذوات القیم کی قیمة عین مال ہوگا . مگر ذوات الأمثال کی قیمت ان کا عین نہیں ہوتا، خنزیر ذوات القیم میں سے ہے . لہذا اس کی قیمت لینا عین خنزیر لینا ہوگا اسی طرح اس کا عشر لینا بھی . لیکن شراب ذوات الأمثال سے ہے ، لہذا شراب کا عشر بصورت قیمة لینا عین شراب لینا نہ ہوگا] .

مذکورہ مسئلے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسلامی سلطنة میں عاشر کو عشر وصول کرنے کا حق اس بناء پر ہے کہ وہ مال کی حفاظة کرتا ہے اور مسلمان انگور سے بنی ہوئی شراب (شراب نما رس) کی حفاظة اپنے لیے کرتا ہے . تاکہ اس سے سرکہ تیار کیا جا سکے ، لہذا جب وہ اپنے لیے اس کی حفاظة کرتا ہے تو دوسرے کے لیے بھی کرے گا . لیکن کوئی مسلمان اپنے لیے خنزیر کی حفاظة نہیں کرتا .

بلکہ اگر وہ غیر مسلم تھا اور بعد میں مشرف باسلام ہوا اس کے لیے واجب ہے کہ وہ اسلام لانے پر پہلے سے موجود خنزیروں کو ضائع کر دے۔ (جب مسلمان اپنے لیے خنزیر کی حفاظۃ نہیں کرتا) تو وہ دوسرے کے لیے بھی اس کی حفاظۃ نہیں کرے گا۔

مسئلہ: بنو تغلب کا کوئی بچہ یا کوئی عورت اگر کچھ مال لے کر عاشر کے پاس سے گزرے تو بچے پر کچھ واجب نہیں ہوگا اور عورت پر جیسا کہ ہم سوائم کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں وہی واجب ہوگا جو بنی تغلب کے مردوں پر ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص عاشر کے پاس سے سو درہم لے کر گزرے اور اس کو بتائے کہ اس کے گھر میں بھی اس کے علاوہ سو درہم ہیں اور ان پر ایک سال کی مدۃ بھی گزر چکی ہے تو عاشر ان سو درہموں کی جو وہ لے کر گزر رہا ہے زکاۃ نہیں لے گا۔ کیونکہ یہ کم ہیں اور جو درہم اس کے گھر میں ہیں وہ اس کی حفاظۃ میں داخل نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص دو سو درہم کی پونجی یعنی مال تجارۃ لے کر گزرے (جب کہ وہ اس کا مالک نہ ہو بلکہ مال کسی دوسرے کا ہو اور اسے صرف تجارۃ کی اجازۃ ہو) تو عاشر اس سے عشر وصول نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کو زکاۃ کی ادائیگی کی اجازۃ نہیں۔

مسئلہ: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شریک عاشر

محصول وصول کرنے والے کے پاس سے گزرنے والا ۵ے
کے پاس سے مال لے کر گزرے (تو اس کی صورة بھی یہی ہوگی) .

امام اعظمؒ کا پہلا قول یہ تھا کہ مضارب سے عشر لیا جائے گا . کیونکہ شراکة کا حق قوی ہوتا ہے (یعنی حصہ دار بھی حق رکھتا ہے لہذا اس سے عشر وصول کیا جا سکتا ہے) . حتی کہ مال کا مالک بھی اس کو مال میں تصرف کرنے سے روکنے کا حق نہیں رکھتا جب کہ یہ مال مال تجارة ہو . (یعنی جب کہ شراکة کا معاہدہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہو) لہذا اس کی حیثیت مالک کی سی ہوگی .

اس کے بعد امام اعظمؒ نے اس قول سے رجوع فرمایا اور وہی رائے قائم کی جو اوپر بیان ہو چکی ہے اور یہی صاحبینؒ کی رائے ہے . اس کی دلیل یہ ہےکہ یہ شخص مال کا مالک نہیں ہے اور نہ اس کی طرف سے نائب ہے کہ مالک کی طرف سے زکاة ادا کرے . البتہ ایسی صورة میں جب کہ مال میں اتنا نفع ہو جائے کہ اس کے حصے کا نفع نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے . تو ایسی صورة میں اس سے عشر وصول کیا جائے گا کیونکہ یہ اس کا مالک ہے .

مسئلہ : اگر کوئی مأذون غلام دو سو درہم کا مال لے کر عاشر کے پاس سے گزرے تو عاشر اس سے عشر وصول کرے گا بشرطیکہ اس پر کوئی قرض نہ ہو .

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں : مجھے اس بات کا علم نہیں کہ امام اعظمؒ نے مندرجہ بالا قول سے رجوع فرما لیا تھا یا

نہیں . (امام اعظمؒ تو ماذون غلام سے عشر لینے کے قائل ہیں مگر امام ابو یوسفؒ قائل نہیں) امام ابو یوسفؒ کی رائے اس مفروضے پر مبنی ہے کہ امام اعظمؒ نے اس کے بعد رجوع کر لیا تھا اور اس کو مضارب پر قیاس کیا تھا (اور مضارب سے عشر وصول نہیں کیا جاتا) اور یہ رائے صاحبینؒ کی ہے کہ عاشر کو ماذون غلام سے عشر نہیں لینا چاہیے کیونکہ ماذون غلام کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیۃ دراصل اس کے مالک کو حاصل ہے اسے تو مال میں صرف تصرف کرنے کا اختیار ہے . لہذا اس کی مثال مضارب کی طرح ہوگی . (کہ جب مضارب سے عشر نہیں لیا جاتا تو اس سے بھی نہیں لیا جائے گا) .

بعض فقہاء نے ان دونوں میں فرق بیان کیا ہے کہ غلام تو ذاتی طور پر تصرف کرتا ہے . حتی کہ اس کے بارے میں مالک سے باز پرس نہیں ہوگی . لہذا یہی شخص حفاظۃ کا محتاج ہے (یعنی ماذون غلام اگر مقروض ہو جائے یا اس پر کوئی دوسرا تاوان لازم ہو جائے تو مالک ذمہ دار نہ ہوگا . بلکہ غلام خود ضامن ہے . اس لیے اسے بہت حد تک مستقل و منفرد حیثیت حاصل ہے . اس لیے وہ خود ہی حفاظۃ کا محتاج ہے لہذا عشر کا دینا ضروری ہوگا) .

لیکن مضارب ایک نائب ہونے کی حیثیت سے مال میں تصرف کرتا ہے . حتی کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کے بارے میں مال کے مالک سے باز پرس کی جائے گی .

مال کا اصل مالک اس حفاظة کا محتاج ہے . لہذا مندرجہ بالا فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے امام اعظمؒ کا رجوع مضارب کے بارے میں تو موجود ہے . لیکن مأذون غلام کے بارے میں ان کا رجوع کرنا ثابت نہیں .

اگر مال کا مالک غلام کے ساتھ ہو تو اس سے عُشر لیا جائے گا . کیونکہ مال پر اس کی ملکیة ہے البتہ اگر مأذون غلام پر اس قدر قرض ہے کہ سارا مال اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے تو ایسی صورة میں اس سے عُشر نہیں لیا جائے گا کیونکہ اب اس میں اس کی ملکیة ثابت نہیں یا مال قرض میں مشغول ہے .

مسئلہ : اور کوئی شخص کسی ایسے علاقے میں چلا جائے . جہاں باغی لوگ غلبہ حاصل کر چکے ہوں اور وہ ان کے عاشر کے پاس سے گزرے اور باغی عاشر اس سے عشر وصول کرلے تو جب یہ شخص اهل العدل عاشر کے پاس سے گزرے تو اس سے دوبارہ عشر وصول کیا جائے گا . کیونکہ غلطی اور کوتاهی اس کی طرف سے سرزد ہوئی ہے کہ یہ اپنی مرضی سے ان کے علاقے میں گیا تھا .

بَابُ فِی الْمَعَادِنِ وَالرِّکَازِ

معدنیات اور مدفون خزانے کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں : سونے ، چاندی ، لوہے، سکے یا تانبے کی کان کسی عشری یا خراجی زمین سے نکل آئے تو احناف کے نزدیک اس پر خُمس واجب ہوگا .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا . کیونکہ کان کا زمین سے برآمد ہونا اس شخص کے لیے مباح ہے . جس نے اسے پایا اور اس کی حیثیت شکار کی مانند ہے . (کھلے علاقے میں جو بھی شکار کرے وہ اس کی ملکیۃ ہوتا ہے) البتہ اگر کان سے برآمد ہونے والی چیز یا معدن ، سونا یا چاندی ہو تو اس میں زکاۃ واجب ہوگی . امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق معدن میں سال کی شرط عائد نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ پورے کا پورا اضافہ ہے (اس پر کچھ خرچ نہیں ہوا اور سارے کا سارا نفع ہے) سال کی شرط اس لیے عائد کی جاتی ہے کہ مال میں اضافہ ہو اور یہاں اس صورۃ میں تو اضافہ ہی اضافہ ہے) .

احناف کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ رکاز پر خمس واجب ہوگا۔ لفظ رکاز رکز سے مشتق ہے۔ لہذا اس کا معدن پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے (اور معدن کو رکاز میں شامل کرتے ہوئے اس پر خمس واجب ہوگا۔ اس سلسلہ میں تین الفاظ کی تشریح ضروری ہے۔ معدن، رکاز اور کنز۔ کنز وہ ہے جسے کوئی انسان زمین میں دفن کرے۔ معدن وہ ہے جسے قدرۃ نے زمین یا پہاڑوں میں پیدا کیا ہے اور رکاز کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک رکاز سے مراد صرف مدفون خزانہ ہے)۔

اس کی دوسری دلیل یہ کہ معدن پہلے کفار کے قبضہ میں تھے پھر مسلمانوں نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا (کیونکہ اسلام سے قبل ساری زمین پر کفار کو غلبہ و استیلاء حاصل تھا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا ہے) لہذا اس سے حاصل ہونے والی شیء غنیمۃ شمار ہوگی اور غنائم میں خمس واجب ہوتا ہے۔ برخلاف شکار کے کہ اس پر کسی کی ملکیۃ نہیں ہوتی اور ہر کوئی شکار کر سکتا ہے۔ (رہا یہ اعتراض کہ اگر مال غنیمۃ ہے تو اس میں سے سب مجاہدین کو حصہ ملنا چاہیے اور اس پر سب کا قبضہ ہونا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے) کہ مجاہدین کو اس پر حکمی طور پر قبضہ حاصل ہے۔ (یعنی یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور مجاہدین کا قبضہ تو صرف سطح زمین پر ہے) لیکن جہاں تک حقیقۃ کا تعلق ہے تو دراصل اس مال کا مالک وہ ہے جس

نے اسے پایا ۔ لہذا ہمارے نزدیک حکمی طور پر جو اس کے مستحق ہیں ان کا حق $\frac{1}{5}$ حصہ حکومت کو ادا کر دیا جائے اور جو حقیقی مستحق ہے اس کو اس کا $\frac{4}{5}$ حصہ دیا جائے گا ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے معدن (کان) کو اپنے مکان میں پایا تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا ۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک خمس واجب ہوگا ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا مذکورہ بالا ارشاد مطلق ہے ۔

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ معدن زمین کے اجزاء میں سے ہے اور یہ اجزاء زمین کے ساتھ خلط ملط ہو چکے ہیں جب پورے اجزاء میں کوئی چیز واجب نہیں تو اس جزء پر بھی کچھ واجب نہ ہوگا ۔ اس لیے کہ جزء اپنے کل سے مختلف نہیں ہوتا ۔ البتہ مدفون خزانہ کی صورۃ اس سے مختلف ہوتی ہے ۔ کیونکہ وہ زمین کے اجزاء سے خلط ملط نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں : اگر کوئی شخص معدن کو اپنی مملوکہ زمین میں پائے تو امام اعظمؒ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں ۔ (پہلی روایۃ کے مطابق اس پر کچھ واجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ مملوکہ زمین کی حیثیۃ گھر کی سی ہوتی ہے اور جب گھر میں معدن نکلنے کی صورۃ میں بھی کچھ واجب نہیں ہوتا تو مملوکہ زمین میں معدن نکلنے کی صورۃ میں بھی کچھ واجب نہ ہوگا) ۔ امام اعظمؒ کی دوسری دلیل کے مطابق مملوکہ زمین میں معدن نکلنے

پر ُخمس واجب ہوگا اور اس کی دلیل الجامع الصغیر کی روایۃ ہے کہ مکان ہر قسم کے ٹیکس وغیرہ سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن زمین ان مالی مشقتوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اسی بناء پر زمین پر ُعشر و خراج واجب ہوتا ہے لیکن مکان پر نہیں۔ (اگر کوئی شخص اپنے مکان میں کوئی پھل دار درخت لگائے یا کاشت کرے تو اس پر کچھ واجب نہیں)۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے رکاز یعنی خزانہ پالیا تو اس پر خمس واجب ہوگا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں بیان ہو چکا ہے اس پر ائمہ کا اتفاق ہے اور رکاز کے اسم کا اطلاق خزانہ پر ہوتا ہے۔ اس کے معنی رکز کے ہیں جس کے معنی گاڑنا اور نصب کرنا ہے۔ (تمام ائمۂ کرام کے نزدیک خزانہ ملنے پر خمس واجب ہوگا)۔

مسئلہ : برآمد ہونے والے خزانے کو دیکھا جائے گا۔ اگر اس خزانے پر اهل اسلام کا ٹھپہ لگا ہو۔ مثلا اس پر کلمہ شہادۃ کندہ ہو تو اس کی حیثیۃ لقطہ (یعنی گری ہوئی شے کے ملنے) کی ہوگی۔ جس کے احکام اپنے مناسب موقع پر بیان کر دیے جائیں گے اور اگر اس پر جاهلیۃ کا ٹھپہ ہو یعنی بت یا صنم کی تصویر ہو تو اس پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہر حالت میں خمس واجب ہوگا۔ (چاہے اسے اپنی زمین سے ملے یا دوسری سے)۔

مسئلہ : اگر کسی شخص نے ارض مباح (یعنی ایسی زمین) میں خزانہ پایا جو کسی خاص شخص کی ملکیۃ نہ ہو

اور سب کے لیے قانونی طور پر اس سے استفادہ جائز ہو) تو پانے والے کو ⅘ حصہ ملے گا ۔ کیونکہ حفاظۃ کا پورا فریضہ اسی نے ادا کیا ہے ۔ جب کہ دوسرے مجاہدین کو اس کا علم تک نہ تھا ۔ لہذا یہ اسی کے ساتھ خاص ہو جائے گا ۔

مسئلہ : اگر اس شخص نے اس کو کسی کی مملوکہ زمین میں پایا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک پانے والا ہی اس کا صحیح مستحق قرار پائے گا ۔ کیونکہ اس کا حق رکھنا اس کی حفاظۃ کی بناء پر ہی تھا اور یہ فریضہ اسی نے ادا کیا ۔ طرفینؒ کے نزدیک اس کا اصل مالک مختط لہ ہے ۔ مختط لہ وہ شخص ہے جس کو سلطان وقت نے آغاز فتح میں اس قطعۂ اراضی کا مالک بنایا ۔ کیونکہ سب سے پہلے اسی شخص کا ہاتھ اس زمین کی طرف بڑھا اور یہ خصوصی قبضہ ہے جس کے ذریعے وہ اس زمین کا اور جو کچھ اس کے اندر ہے مالک قرار پائے گا ۔ اگرچہ بظاہر اسے زمین ہی مل رہی ہے ۔ اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایسی مچھلی کا شکار کیا جس کے پیٹ میں موتی ہو تو یہ اس موتی کا بھی مالک ہوگا ۔ پھر اس مچھلی کے فروخت کرنے سے یہ موتی اس کی ملکیۃ سے نہیں نکلے گا ۔ کیونکہ موتی اس میں امانت رکھا ہوا ہے ۔ یا مختط لہ کے اس زمین کے فروخت کر دینے سے یہ خزانہ اس کی ملکیۃ سے نہیں نکلے گا ۔ کیونکہ خزانہ اس میں امانت رکھا گیا تھا ۔ البتہ معدن کی صورۃ اور ہے کیونکہ وہ زمین کے اجزاء میں شامل ہوتی ہے ۔ لہذا اس کی ملکیۃ خریدار کی طرف منتقل ہو جائے

کی ۔ اگر مختط لہ کا پتا نہ چلے تو اس کے بعید ترین مالک جس کا پتا چل جائے اس کو یہ خزانہ لوٹا دیا جائے گا یعنی وہ مسلمانوں میں سے بعید ترین ہو ۔

اگر نقش یعنی ٹھپہ مشتبہ ہو جائے تو اس کو ظاہر مذہب کے مطابق جاہلی شمار کیا جائے گا ۔ کیونکہ اصل وہی ہے (پہلے چونکہ کفر ہی کفر تھا اسلام بعد میں آیا اس لیے اس قسم کا جو خزانہ مسلمان کے ہاتھ لگے گا وہ کفار کا ہوگا) بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اس مشکوک سکے کو اسلامی سکہ شمار کیا جائے گا ۔ کیونکہ اسلام کو آئے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے ۔

مسئلہ : اگر کوئی شخص امان لے کر دارالحرب میں چلا جائے اور وہاں کسی کے گھر میں اس کے ہاتھ خزانہ لگے تو وہ خزانے کو انہیں واپس کر دے تاکہ عہد شکنی سے محفوظ رہے ۔ کیونکہ گھر سے جو کچھ برآمد ہو اس کی ملکیۃ خصوصی طور پر صاحب خانہ کی ہوتی ہے ۔

مسئلہ : اگر کسی نے (دارالحرب کے) صحراء میں خزانہ پایا تو وہی اس کا مالک ہوگا ۔ کیونکہ صحراء سے برآمد شدہ خزانہ خصوصی طور پر کسی فرد خاص کی ملکیۃ نہیں اور اسی بناء پر (اس خزانے کا لے لینا) عہد شکنی پر محمول نہیں کیا جائے گا اور اس خزانے پر کوئی (خمس وغیرہ) واجب نہیں ہوگا ۔ کیونکہ اس خزانے کو پانے والے کی حیثیت چور کی سی ہے جو چھپ کر چوری کرتا ہے (یعنی یہ مال

غنیمۃ شمار نہیں ہوگا کیونکہ یہ بزور شمشیر حاصل نہیں کیا گیا ۔ جس طرح مسروقہ مال پر خمس واجب نہیں ہوتا اس طرح اس پر بھی واجب نہیں ہوگا) ۔

مسئلہ : پہاڑوں سے نکلنے والے فیروزے پر خمس واجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ پتھر پر خمس واجب نہیں ۔

مسئلہ : سیماب پر خمس واجب ہوگا ۔ یہ امام اعظمؒ کی آخری رائے ہے اور یہی امام محمدؒ کا قول ہے ۔ مگر اس مسئلے میں امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے ۔

مسئلہ : طرفینؒ کے نزدیک موتی اور عنبر میں خمس واجب نہیں ہوگا ۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ دونوں میں خمس واجب ہوگا کیونکہ حضرت عمرؓ نے عنبر سے پانچواں حصہ لیا تھا ۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ سمندر کی گہرائی میں کوئی شخص غلبے سے نہیں پہنچتا ۔ لہذا سمندر سے حاصل ہونے والی اشیاء پر غنیمۃ کا اطلاق نہیں ہوگا ۔ اگرچہ وہ سونا اور چاندی ہی کیوں نہ ہو ۔

جہاں تک حضرت عمرؓ والی روایۃ کا تعلق ہے اس کی صورۃ یہ ہے کہ جب سمندر اپنے مد یا طلاطم کی بناء پر ایسی اشیاء ساحل پر پھینک دے (تو اس پر خمس واجب ہوگا) اور اس صورۃ میں ہم بھی امام ابو یوسفؒ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں ۔

مسئلہ : اگر کسی شخص کو کوئی سامان یا خزانہ ہاتھ لگے . (مثلاً برتن ، ہتھیار وغیرہ یعنی سونے چاندی کے علاوہ اور چیز) تو یہ پانے والے کی ملکیۃ ہوگا اور اس پر خمس واجب ہوگا . اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس شخص نے اس سامان کو کسی ایسی زمین میں پایا جس کا کوئی مالک نہیں (اگر یہ زمین کسی کی ملکیۃ ہے تو سامان مالک کا ہوگا) کیونکہ یہ مال مال غنیمۃ ہے . جیسا کہ سونا چاندی . (لہذا اس مال پر خمس واجب ہوگا) .

وَاللہ أعلَمُ بالصّواب

بَابُ زَکٰوۃ الزُّرُوعِ وَالثِّمارِ

سبزیوں اور پھلوں کی زکاۃ کا بیان

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار (خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر) اس پر عشر واجب ہوگا . چاہے وہ سیلاب کے پانی سے سیراب ہو یا بارش سے . البتہ لکڑی ، بانس اور گھاس کو عشر سے مستثنٰی قرار دیا جائے گا .

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ پیداوار پر ُعشر واجب نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ اس کا پھل باقی رہنے والا ہو . نیز اس کی مقدار پانچ وسق تک پہنچ جائے اور ایک وسق کی مقدار ساٹھ صاع ہے اور صاع سے مراد نبی اکرم ﷺ کا خصوصی پیمانہ ہے .

صاحبینؒ کے نزدیک سبزیوں پر بھی ’عشر واجب نہیں ہے‘ پس صاحبینؒ اور امام اعظمؒ کے مابین اختلاف دو موقعوں پر ہے :

۱- نصاب کی شرط عائد کرنے میں .

۲- پھل کے باقی رہنے کی شرط عائد کرنے میں .

صاحبینؒ کی دلیل شرط اول عائد کرنے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ پانچ وسق سے کم مقدار میں صدقہ واجب نہ ہوگا۔

صاحبینؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ چونکہ زکاۃ ہے ، لہذا اس میں نصاب کی شرط عائد کرنا ضروری ہے ، تاکہ مالک کا غنی ہونا ثابت ہو جائے۔ امام اعظمؒ اس کے جواب میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ زمین سے جو بھی پیداوار حاصل ہو اس پر عُشر واجب ہوگا۔

اس میں کوئی مقدار عُشر سے مستثنٰی قرار نہیں دی گئی (کہ پانچ وسق سے کم ہو تو عشر واجب نہ رہے) اور اس حدیث سے مراد جو صاحبینؒ نے روایۃ کی یہ ہے کہ مال تجارۃ میں اس مقدار کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ کیونکہ عرب تاجر وسق کے پیمانے سے خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور ایک وسق کی قیمت چالیس درہم ہے۔ (لہذا پانچ وسق دو سو درہم کے برابر ہوئے اور یہی نصاب ہے)۔ (ولأنه صدقة فيشرط فيه النصاب لتحقق الغناء کے جواب میں امام اعظمؒ فرماتے ہیں) عشر میں جب مالک کا اعتبار بھی نہیں کیا جاتا (حتٰی کہ وقف زمین سے بھی عشر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح عشر کے سلسلے میں عقل و بلوغ اور حولان حول کا لحاظ بھی نہیں ہوگا) تو اس کی صفت یعنی غناء کا لحاظ رکھنا بھی ضروری نہیں۔ (اس لیے نصاب کا کامل ہونا شرط نہ ہوگا) یعنی جب کہ پہلی تین شرائط

کو پیش نظر نہیں رکھا گیا، تو صاحب نصاب ہونا بھی عقلی لحاظ سے ضروری نہیں۔ بلکہ اس کی نقلی دلیل آنحضرت ﷺ کی روایۃ پہلے بیان کی جا چکی ہے) اور اسی بناء پر حولان حول کی شرط سبزی اور پھلوں کی صورۃ میں یا غلے کی صورۃ میں عائد نہ ہوگی۔ کیونکہ سال کی شرط لگانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فصلیں حاصل ہو جائیں اور مال میں نشو و نما ہو اور زمین سے حاصل شدہ غلہ، سبزی اور پھل سب کا سب نما ہے لہذا اس پر عشر واجب ہوگا۔

صاحبین دوسری صورۃ میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی سے استدلال کرتے ہیں کہ سبزیوں میں صدقہ واجب نہیں ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے متفقہ طور پر زکاۃ کی نفی لازم نہیں آتی۔ لہذا ثابت ہوگیا کہ حدیث کا مقصود عشر کی نفی کرنا لازم ہے۔ (یعنی حدیث میں جو صدقہ کا لفظ ہے۔ اس سے زکاۃ تو مراد نہیں ہے۔ لہذا عشر ہی مراد ہوگا اور عشر واجب نہ ہوگا)۔

امام اعظم کی دلیل نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ (یعنی ما أخرجت الأرض ففیه العشر) اور جہاں تک صاحبین کی روایۃ کردہ حدیث کا تعلق ہے اس کو اس صدقے پر محمول کیا جائے گا۔ جو عاشر وصول کرتا ہے (مثلاً اگر کوئی تاجر سبزیوں کے ٹرک لے کر عاشر کے پاس سے گزرے تو اس سے عاشر عشر وصول نہیں کرے گا) اور اس رائے کی امام اعظم بھی تائید کرتے ہیں۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ زمین میں بعض دفعہ ایسی اشیاء بھی کاشت کی جاتی ہیں جن کا پھل باقی رہنے والا نہیں ہوتا ، (مثلاً خربوزہ ، ککڑی وغیرہ) صدقہ کے واجب ہونے کا اصل سبب ارض نامی ہے اور اسی بناء پر اس پر خراج واجب ہوتا ہے ۔ (اگر کوئی شخص قابل کاشت خراجی زمین میں کچھ بھی کاشت نہ کرے تب بھی حکومۃ خراج وصول کرے گی ۔ کیونکہ اس میں حکومۃ کا قصور نہیں ، بلکہ اس کے مالک کا ہے ۔ اسی طرح عشر کا وجوب بھی ہوتا ہے) ۔

مسئلہ : جہاں تک لکڑی ، بانس (یا نرکل) اور گھاس کا تعلق ہے ۔ عام طور پر ان اشیاء کو باغوں میں کاشت نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ (اگر یہ اتفاق سے باغ میں اگ آئیں تو) انہیں باغوں سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے ۔

اگر کسی شخص نے ارادۃً باغ کے کسی حصے کو اس کام کے لیے مخصوص کر دیا ۔ کہ وہاں بانس بوئے جائیں یا درخت لگائے جائیں یا گھاس پیدا کی جائے تو ایسی صورۃ میں ان تینوں اشیاء پر بھی عشر واجب ہوگا اور یہاں قصب سے مراد قصب فارسی ہے (جس سے قلم وغیرہ بنائے جاتے ہیں) جہاں تک گنے اور قصب الذریرہ یعنی دار چینی کا تعلق ہے ۔ ان دونوں پر عشر واجب ہوگا کیونکہ ان دونوں کی کاشت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زمین سے ان کی پیداوار حاصل کی جائے ۔ بخلاف بچے ہوئے ڈنٹھل اور الگ ہونے والے بھوسے کے ، کیونکہ ان دونوں سے مقصود پھل اور دانے ہوتے ہیں ۔

یہ دونوں (ڈنٹھل اور بھوسہ) مقصود نہیں ہوتے۔

مسئلہ : جس زمین کو ڈول سے سیراب کیا جائے یا دولاب سے پانی دیا جائے یا اونٹوں پر لاد کر پانی لایا جائے اور اس سے سیراب کیا جائے تو ایسی زمین پر دونوں قولوں کے مطابق نصف عشر واجب ہوگا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورتوں میں کاشت کار کو زیادہ مشقۃ کا سامنا ہوتا ہے اور پہلی صورۃ میں جب کہ زمین بارش کے پانی یا سیلاب سے سیراب ہو کم مشقۃ برداشت کرنا پڑتی ہے (لہذا باوانی زمین پر عشر ، اور پانی کا از خود انتظام کرنے پر نصف عشر واجب ہوگا)۔

مسئلہ : اگر زمین سیلاب کے پانی سے بھی سیراب ہوتی ہو اور ڈول سے بھی اسے سیراب کیا جاتا ہو (تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر عشر واجب ہوگا یا نصف عشر کیونکہ زمین دونوں طریقوں سے سیراب کی گئی ہے) تو سال کے بیشتر حصے کا اعتبار ہوگا۔ جیسا کہ سوائم کے بیان میں گزر چکا ہے (یعنی جس طرح جانوروں کے سلسلے میں سال کا بیشتر حصہ ملحوظ ہوتا ہے۔ اگر مویشی سال کا اکثر حصہ چراگاہ میں گزاریں تو سائمہ ہوں گے۔ ورنہ علوفہ اسی طرح اگر کاشت کار نے سال کا اکثر و بیشتر حصہ زمین کو کنوئیں کے پانی سے سیراب کیا تو نصف عشر واجب ہوگا اور اگر زمین سال کے اکثر حصے میں سیلاب یا بارش سے سیراب ہوتی رہی تو اس صورۃ میں عشر واجب ہوگا)۔

مسئلہ : امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ زعفران یا کپاس جیسی چیز جس کو وسق کے پیمانے سے نہیں ماپا جاتا، اس میں عشر واجب ہوگا۔ بشرطیکہ ماپ والی چیزوں میں سے جب کسی سب سے سستی چیز کی قیمت پانچ وسق کی مقدار تک پہنچ جائے جیسے آج کل مکئی ہے۔ تو اس صورۃ میں اس پر عشر واجب ہوگا کیونکہ ایسی اشیاء کے شرعی نصاب کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ان کی قیمۃ کا بھی اسی طرح لحاظ رکھا جائے گا جس طرح کہ مال تجارۃ میں اندازہ کیا جاتا ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان پر عشر واجب ہوگا جب کہ ان کی مقدار پانچ ایسے بڑے پیمانوں کے مطابق ہو جائے جن کے ساتھ اس جنس کو ماپا جاتا ہے۔ مثلاً کپاس میں پانچ گانٹھوں کا اعتبار ہوگا جب کہ ہر گانٹھ تین سو سیر یعنی ساڑھے سات من وزنی ہو یا زعفران پانچ سیر تک پہنچ جائے۔ (کیونکہ زعفران کو عموماً تولے، چھٹانک، پاؤ اور سیر سے تولا جاتا ہے اور ان میں بڑا پیمانہ سیر کا ہے۔ لہذا پانچ سیر زعفران پر عشر واجب ہوگا)۔ وسق کا اعتبار انھی اجناس میں ہوگا جن کے لیے یہ سب سے بڑا پیمانہ ہے۔ (یعنی جس قسم کی جنس ہوگی اسی قسم کا بڑا پیمانہ معیار ہوگا۔ مثلاً غلے وغیرہ میں وسق، زعفران اور دوسری تول کی چیزوں میں سیر اور روئی وغیرہ میں گانٹھوں کا حساب ہوگا۔

مسئلہ : شہد پر عُشر واجب ہے جب کہ یہ عشری زمین سے حاصل کیا جائے۔

امام شافعیؒ وجوب عشر کے قائل نہیں کیونکہ شہد حیوان سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا اس کی مشابہت ریشم سے ہوگی(تمام ائمہ ریشم پر وجوب عشر کے قائل نہیں۔ شہد پر بھی عشر نہ ہوگا کیونکہ یہ شہد کی مکھی کی پیداوار ہے زمین کی نہیں)۔

احناف نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادگرامی سے استدلال کرتے ہیں ''کہ شہد میں عشر واجب ہوتا ہے''۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ شہد کی مکھی پھلوں اور پھولوں سے رس حاصل کرتی ہے اور ان دونوں پر عشرواجب ہے لہذا ان کے رس سے پیدا شدہ چیز پر بھی عشر ہی واجب ہوگا۔ البتہ ریشم کے کیڑے کی نوعیۃ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہ پتوں سے غذا حاصل کرتا ہے اور پتوں پر عشر واجب نہیں ہوتا۔

امام اعظمؒ کے نزدیک شہد پر بہر صورۃ عشر واجب ہوگا۔ خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ کیونکہ انہوں نے نصاب کا اعتبار نہیں کیا۔ (ان کی دلیل یہی ہے کہ ما أخرجت الأرض ففیه العشر)۔

امام ابو یوسفؒ کی نزدیک شہد کا نصاب وہ قیمۃ ہے جو ادنی جنس کی پانچ وسق مقدار کی قیمۃ ہوتی ہے، جیسا کہ ان کا اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی دوسری رائے یہ ہے کہ شہد پر عشر واجب نہ ہوگا۔ جب تک کہ اس کی مقدار دس مشکیزے نہ ہو جائے۔ اس کی دلیل بنو شبابہ کی وہ حدیث ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو شہد کا عشر اسی طرح ادا کیا کرتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ کی تیسری رائے میں شہد کا نصاب پانچ سیر ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک شہد کا نصاب پانچ فرق ہے اور ایک فرق کی مقدار چھتیس رطل ہے۔ (رطل تقریباً آدھ سیر وزن کا ہوتا ہے) امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ وہ سب سے بڑا پیمانہ ہے جس کے ساتھ ایسی چیزوں کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح گنے کے سلسلے میں بھی ائمہ میں اختلاف ہے۔

پہاڑوں میں جو شہد اور پھل پائے جاتے ہیں ان پر عشر واجب ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ پہاڑوں سے حاصل ہونے والی پیداوار پر عشر نہیں۔ کیونکہ زکاۃ واجب ہونے کا سبب کہ زمین قابل کاشت ہو معدوم ہے۔

ظاہر الروایۃ کی توجیہ یہ ہے کہ قابل کاشت زمین سے اصل مقصد جو پیش نظر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس میں سے پیداوار حاصل ہو سکے اور وہ ہمیں حاصل ہے۔

مسئلہ: ہر وہ پیداوار جو زمین سے حاصل ہو اور اس میں عشر واجب ہو۔ اس عشر میں سے مزدوروں کی اجرۃ یا جانوروں کا خرچ وضع نہیں کیا جائے گا اس کی دلیل یہ ہے

کہ نبی کریم ﷺ نے کاشت کاری کی مشقۃ کے تفاوۃ کے پیش نظر واجب میں بھی تفاوۃ فرما دیا ہے ۔ (یعنی زمین کی سیرابی اور مشقۃ کو ملحوظ رکھتے ہوئے واجب میں فرق پڑ جاتا ہے ۔ اگر زمین بارش یا سیلاب سے سیراب ہو تو شریعۃ نے دسواں حصہ مقرر کیا ، لیکن کنوئیں سے سیراب کرنے میں چونکہ محنۃ زیادہ ہوتی ہے ۔ اس لیے شریعۃ نے واجب کو کم کرکے نصف عشر مقرر کر دیا ۔ شریعۃ نے ہر حالۃ میں کاشت کار کی سہولت کو پیش نظر رکھا ہے) ۔ لہذا مذکورہ بالا اجرۃ اور خرچ کو وضع کرنے کا کوئی جواز نہ ہوگا ۔

مسئلہ : اگر کسی تغلبی کے پاس عشری زمین ہو تو اس سے دگنا عشر وصول کیا جائے گا ۔ صحابہ کرام رض کا اجماع اسی بات پر معروف ہے ۔

امام محمد رح فرماتے ہیں جو زمین تغلبی نے کسی مسلمان سے خرید کی ہو اس پر صرف ایک ہی عشر واجب ہوگا ۔ کیونکہ امام محمد رح کے نزدیک زمین کا لگان مالک کے بدل جانے سے تبدیل نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : اگر تغلبی سے یہ زمین کوئی ذمی خرید لے تو بھی لگان کی صورۃ یہی رہے گی ۔ اس میں سب ائمہ کا اتفاق ہے کیونکہ ان سب صورتوں میں ذمی سے دگنا وصول کرنے کا جواز موجود ہے ۔ کہ کوئی ذمی اگر کسی عاشر کے پاس سے گزرے تو اس سے مسلمان سے دگنا حصہ وصول کیا جاتا ہے مسلمان سے چالیسواں حصہ لیا جاتا ہے اور ذمی سے دگنا یعنی بیسواں) ۔

اسی طرح اگر تغلبی یا ذمی سے کوئی مسلمان زمین خرید لے یا تغلبی اسلام لے آئے تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس سے دگنا عشر وصول کیا جائے گا ۔ خواہ عشر کا یہ دگنا اصل اعتبار سے ہو (یعنی زمین شروع ہی سے تغلبی کی ملکیۃ چلی آتی ہو) یا حادث ہو (یعنی تغلبی یا ذمی سے کسی مسلمان نے خرید لی ہو ۔ دونوں صورتوں میں دگنا واجب ہوگا) عشر کا یہ دگنا ہونا اس زمین کا وظیفہ قرار دیا جا چکا ہے ۔ لہذا کوئی مسلمان اگر یہ زمین خرید کرے گا تو یہ خراج کی طرح تمام شرائط کے ساتھ اس کی طرف منتقل ہوگی ۔ (اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم سے کوئی قابل کاشت زمین خرید لے تو وہ اس پر عشر نہیں ادا کرے گا بلکہ خراج دے گا ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس زمین پر صرف ایک عشر واجب ہوگا ۔ (کسی مسلمان سے اگر کوئی تغلبی زمین خرید لے اور خریدنے کے بعد مسلمان ہو جائے یا اس کی اپنی زمین ہو اور وہ مسلمان ہو جائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس سے ایک ہی عشر وصول کیا جائے گا) ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دگنا عشر وصول کرنے کا اصل سبب (کفر تھا جو) زائل ہو چکا ہے (لہذا مسلمانوں کی طرح اس سے بھی ایک عشر ہی وصول کیا جائے گا) ۔ صحیح روایت کے مطابق امام محمدؒ بھی اسی قول کی تائید کرتے ہیں ۔

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ کے متعلق مختلف کتابوں میں مختلف اقوال درج ہیں ۔ زیادہ مشہور رائے یہ ہے کہ وہ

امام اعظمؒ کے ساتھ متفق ہیں کہ عشر دگنا ہی باقی رہے گا ۔
البتہ یہ اسی صورۃ میں ہے جب کہ تغلبی کے پاس یہ زمین اس
کی اپنی ملکیۃ ہو کیونکہ بعد میں آنے والی زمین پر عشر دگنا
کرنا واجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ امام محمدؒ کے اصول کے مطابق
مالک کے بدلنے سے زمین کا وظیفہ تبدیل نہیں ہوتا ۔

مسئلہ : اگر کسی مسلمان کی زمین کوئی نصرانی خرید
لے ۔ نصرانی سے مراد ذمی ہے تغلبی نہیں (کیونکہ تغلبی کے
احکام تو اوپر بیان ہو چکے ہیں) اور وہ اس پر قبضہ کر لے
تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس پر خراج واجب ہوگا ۔ اس کی
دلیل یہ ہے کہ خراج کافر کی حالۃ کے زیادہ مناسب ہے
(مسلمان کو جو مراعات دی گئی ہیں غیر مسلم اس کا مستحق
نہیں ۔ لہذا کافر سے عشر کی بجائے خراج وصول کیا جائے گا ۔
نیز ایک لحاظ سے عشر میں عبادۃ کا پہلو بھی موجود ہے اور
کافر سے عبادۃ متوقع نہیں ۔ لہذا کافر سے خراج وصول کیا
جائے گا اور مسلمان سے عشر) ۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نصرانی سے دگنا عشر وصول
کیا جائے گا اور اس حاصل شدہ رقم کو خراج کے مصارف میں
خرچ کیا جائے گا ۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تغلبی
سے دگنا حاصل کرکے خرچ کیا جاتا ہے اور لگان میں تبدیلی
نسبتاً آسان ہے ۔ (یعنی خراج کی بجائے عشر کو دگنا کر دینا
زیادہ آسان اور مناسب ہے) ۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ زمین حسب سابق عشری ہی

رہے گی ۔ کیونکہ یہ عشر خراج کی طرح زمین کے لیے وظیفہ ہو چکا ہے ۔ لہذا تبدیل نہیں کیا جائے گا ۔ (خراجی زمین مسلمان کے پاس آ کر بھی خراجی ہی رہتی ہے) ۔

رہا اس کا مصرف تو ایک روایۃ کے مطابق اس کو زکاۃ کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا ۔

اور دوسری روایۃ یہ ہے کہ اسے خراج کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا ۔

اگر مسلمان اپنی زمین کسی غیر مسلم کے پاس فروخت کر دے ۔ لیکن دوسرا مسلمان حق شفعہ کی بناء پر اسے خود حاصل کرے یا یہ زمین فروخت کنندہ کو پھر واپس ہو جائے ۔ یعنی یہ سودا یا بیع منسوخ ہو جائے تو ایسی صورۃ میں یہ زمین بدستور عشری رہے گی ۔ جہاں تک پہلی صورۃ کا تعلق ہے (کہ حق شفعہ کی بناء پر زمین مسلمان کے پاس چلی جائے تو یہ عشری رہے گی) کیونکہ سودا دراصل اس مسلمان کے حق میں منتقل ہو چکا ہے جس نے شفعہ کا دعوی کیا تھا ۔ گویا صورۃ یہ ہے کہ یہ زمین مسلمان ہی نے دوسرے مسلمان سے خریدی ۔

جہاں تک دوسری صورۃ کا تعلق ہے (کہ شرائط بیع مکمل نہ ہونے پر زمین اصل مالک کی طرف لوٹ آئے) تو اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ زمین بیع کے فسخ ہونے کی بناء پر اپنے اصل مالک کی طرف لوٹا دی گئی ہے تو اس کی صورۃ یہ ہوگی گویا کہ اسے فروخت ہی نہیں کیا گیا ۔ اس کی دلیل یہ ہے

کہ فروخت کرنے والے مسلمان کا حق اس کے فروخت کرنے سے ابھی پورے طور پر منقطع نہیں ہوا. کیونکہ فروخت کرنے والے کو (شرائط پورا نہ ہونے کی بناء پر) اپنے مال کو لوٹا لینے کا حق حاصل ہے.

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کے پاس زمین کا ایک ایسا قطع ہو جو اسے اس زمین کے مسلمانوں کے قبضہ میں آنے کے بعد پہلی بار حاصل ہوا. (یعنی وہ زمین حاکم وقت نے اس کے لیے مخصوص کر دی) اور اس شخص نے اپنے اس مکان کو باغ میں منتقل کر دیا تو اس پر عُشر واجب ہوگا. (عام حالات میں ہر اس زمین پر جس پر مکان بنا لیا گیا ہو کوئی عشر یا خراج واجب نہیں ہوتا. لیکن اس صورۃ میں جب کہ اس مکان کو کھیت یا باغ میں منتقل کر دیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار پر عُشر یا خراج واجب ہوگا) اس سے مراد یہ ہے کہ جب مالک اسے عشری پانی سے سیراب کرے (تو عشر واجب ہوگا) اور اگر اس زمین کو خراج کے پانی سے سیراب کیا جائے تو اس پر خراج واجب ہوگا. اس کی توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا صورتوں میں پانی کی نوعیۃ کے مطابق اس کا لگان بدلتا رہتا ہے.

مسئلہ : مجوسی کے مکان پر کچھ واجب نہ ہوگا. (اصولی اعتبار) سے یہ رعایۃ صرف مسلمان ہی کو حاصل ہونی چاہیے تھی لیکن یہ مجوسی کو بھی دی جائے گی) کیونکہ حضرۃ عمرؓ نے ان کے گھروں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا.

لیکن اگر یہ مجوسی اپنے مکان کو باغ میں بدل دے تو اس پر خراج واجب ہوگا ۔ خواہ اس نے اسے عشری پانی ہی سے کیوں نہ سیراب کیا ہو ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ غیر مسلم کی زمین پر عشر واجب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں عبادۃ کا ایک پہلو موجود ہے ۔ لہذا اس سے خراج ہی وصول کیا جائے گا اور خراج ایک ایسا تاوان ہے جو غیر مسلم کے زیادہ مناسب حال ہے ۔

صاحبینؒ کے قیاس کے مطابق عشری پانی کی صورۃ میں عشر واجب ہوگا ۔ البتہ امام محمدؒ کے نزدیک صرف ایک عشر واجب ہوگا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دو عشر واجب ہوں گے ۔ اس کے دلائل پہلے بیان کیے جا چکے ہیں ۔

مسئلہ : عشری پانی سے مراد وہ پانی ہے جو بارش کا ہو یا کنوؤں سے حاصل کیا گیا ہو یا چشموں سے حاصل ہو یا اسے دریاؤں اور سمندر سے لیا گیا ہو اور وہ کسی فرد واحد کی ملکیۃ اور نگرانی میں نہ ہو ۔

خراجی پانی ان نہروں کا پانی ہے جنہیں عجمیوں نے کھودا ہو ۔ جیحون ، سیحون ، دجلہ اور فرات کا پانی امام محمدؒ کے نزدیک عشری ہے ۔ ان کے نزدیک مذکورہ بالا دریا کسی فرد واحد کی ملکیۃ نہیں بلکہ ہر شخص ان سے اپنی ضرورۃ و استطاعۃ کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے) کیونکہ سمندر کی طرح دریا کسی کی نگرانی و حفاظۃ میں نہیں ۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان دریاؤں کا پانی خراجی

ہے ، کیونکہ ان دریاؤں پر کشتیوں کے پل باندھے گئے ہیں اور یہ ان پر (ان کے) قبضہ کا نشان ہے ۔

مسئلہ : تغلبی بچے اور تغلبی عورت کی زمین پر وہی کچھ واجب ہوگا ۔ جو تغلبی مرد کی زمین پر واجب ہوتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ عشری زمین سے ان سے دگنا عشر وصول کیا جائے گا اور خراجی زمین سے ایک ہی خراج لیا جائے گا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تغلبیوں سے صلح دوگنے صدقے پر طے ہوئی تھی اور اس شرط میں محض مالی مشقة (مثلاً خراج) مذکور نہیں تھی ۔ نیز مسلمان بچوں اور عورتوں سے عشر وصول کیا جاتا ہے ۔ لہذا تغلبی بچے اور تغلبی عورت سے عشر سے دوگنا وصول کیا جائے گا ۔

مسئلہ : قیر اور گندھک کے چشموں پر جب کہ یہ عشری زمین سے برآمد ہوں ، عشر واجب نہ ہوگا کیونکہ یہ زمین کی پیداوار شمار نہ ہوں گے ۔ نیز اس چشمے کی حیثیة جو زمین سے ابلتا ہے پانی کے چشمے کی طرح ہے ۔ (آج کل تو تیل وغیرہ کے چشمے اور کنوئیں حکومة کی ملکیة ہیں اور بے شمار آمدنی کا ذریعہ ہیں) ۔

اگر مذکورہ بالا چشمے خراجی زمین سے برآمد ہوں تو ان پر خراج واجب ہوگا اور یہ خراج اسی صورة میں واجب ہوگا ۔ جب کہ اس کی چار دیواری یعنی وہ زمین جس سے یہ برآمد ہوئے ہیں قابل کاشت ہو ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خراج اس وقت واجب ہو جاتا ہے ۔ جب مزارع کو اس زمین سے

پیداوار حاصل کرنے پر قدرۃ حاصل ہو ۔ (خواہ زمین میں کوئی کاشت نہ کی گئی ہو اس سے کوئی پیداوار حاصل نہ ہو اس سے خراج وصول کیا جائے گا ۔ کیونکہ مزارع نے خود ہی قابل کاشت زمین سے کوئی استفادہ نہیں کیا ۔ حالانکہ حکومۃ کی کی طرف سے زمین کی حفاظۃ میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ۔ لہذا ایسی زمین سے خراج وصول کیا جائے گا) ۔

بَابُ مَنْ يَجُوزُ دَفْعُ الصَّدَقَاتِ وَمَنْ لَا يَجُوزُ

زکاۃ کا بیان کہ یہ کن لوگوں کو دی جا سکتی ہے اور کن کو نہیں

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں اصل حکم جس پر اس مسئلہ کی بنیاد ہے اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے : إنما الصدقات للفقرآء الآیة ، زکاۃ کی ادائیگی کے لیے یہ آٹھ مصارف ہیں . جس میں تألیف قلوب والی مد ساقط ہو چکی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اسلام کو اس قدر شان و شوکۃ اور عظمۃ و سطوۃ عطا فرما دی ہے کہ غیر مسلموں کی تألیف قلوب سے مستغنی کر دیا ہے . (موجودہ دور میں تألیف قلوب کی اشد ضرورۃ ہے کیونکہ تنگدست لوگ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر تبدیلی مذہب پر مجبور ہو جاتے ہیں . عیسائی مشنری اسی حربے کو کارآمد بنا کر عیسائیۃ اورگمراہی کی اشاعۃ کر رہے ہیں . اہل اسلام کا فرض اولیں ہے کہ فقراء کی دیکھ بھال کریں اور انہیں ورطۂ ضلالۃ میں غرق ہونے سے بچائیں . رہا یہ سوال کہ صدر اول میں اس مد کو کیوں ساقط کر دیا گیا ؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مد کی ضرورۃ

و اهمیة کم تھی اور دوسری مدوں کی ضرورۃ و اهمیة بہت زیادہ تھی جس کی بناء پر اس مد کو معطل کر دیا گیا تھا۔ منسوخ نہیں کیا گیا اور کوئی شخص احکام الہی کو قطعی یا ابدی طور پر منسوخ نہیں کر سکتا) ۔

اور اسی پر صحابہ کرام رض کا اجماع منعقد ہوا تھا ۔ (کہ اس مد میں زکاۃ خرچ نہ کی جائے ۔ اگر سوال کہا جائے کہ اجماع نصّ صریح کے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتا تو اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ من قبیل انتهاء الحکم بانتهاء العلة ہے ۔ یعنی جب تک علة (ضعف اسلام) موجود تھی حکم (یعنی مؤلفة القلوب کو زکاۃ دینا) بھی موجود تھا ۔ مگر جب اسلام کو عظمة و سطوۃ حاصل ہوگئی اور علة جاتی رہی تو حکم بھی مرفوع ہوگیا ۔ موجودہ دور میں علة کا وجود پھر شدة سے پایا جاتا ہے ۔ لہذا حکم بھی موجود ہوگا ۔ اور تألیف قلوب کی مد میں زکاۃ صرف کی جائے گی) ۔

مسئلہ : فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو (لیکن نصاب سے کم موجود ہو) اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہو ۔ فقیر و مسکین کی یہ تفریق امام اعظم رح سے مروی ہے ۔ بعض نے اس کے برعکس بھی کہا اور ہر ایک کے الگ الگ دلائل ہیں ۔ (پہلی صورۃ کی وجہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے أو مسکیناً ذامتربة اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو ۔ (دوسری صورۃ کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے : أماالسفینة فکانت لمساکین

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشتی کے مالک ہونے کے باوجود مسکین کہا گیا) .

آیا مسکین اور فقیر دو الگ الگ اقسام ہیں یا ایک ہی قسم ہیں . اس کو إن شاء اللہ العزیز وصیة کے بیان میں ذکر کیا جائے گا .

مسئلہ: عامل وہ ہے جس کو سلطان وقت مقرر کرے اور پھر اس کو اس کے کام کے مطابق اس کا معاوضہ عطا کرے . جو کم از کم اس قدر ہو جس سے اس عامل اور اس کے اہل و عیال کی کفالة ہو سکے . لیکن اس میں آٹھویں حصے کا لحاظ نہ ہوگا .

امام شافعیؒ سے اس میں اختلاف منقول ہے . (وہ فرماتے ہیں کہ عامل کو وصول شدہ زکاۃ کا آٹھواں حصہ دیا جائے گا . کیونکہ قرآن حکیم میں زکاۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک ان آٹھوں اقسام کو بحصہ برابر زکاۃ کا ادا کرنا ضروری ہے . لہذا عاملین کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا . لیکن احناف کے نزدیک آٹھویں حصے کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں . بلکہ عامل کے کام کے مطابق اس کا معقول معاوضہ زکاۃ میں سے ادا کیا جائے گا) .

احناف کی دلیل یہ ہے کہ عامل کا مستحق زکاۃ قرار پانا اس بناء پر ہے کہ اس کی کفالة کا انتظام ہو سکے اور اسی بناء پر ایک عامل مال دار ہونے کے باوجود مال زکاۃ میں سے تنخواہ لے سکتا ہے . البتہ اس میں صدقہ کا شبہ موجود ہے . لہذا

ایک ہاشمی عامل کو معاوضے کے طور پر زکاۃ نہیں دی جائے گی۔ اس میں اس امر کا احترام پیش نظر ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کا قریبی ہے۔ کیونکہ اس میں میل کچیل کا شبہ پایا جاتا ہے۔ البتہ مال دار شخص کا اس شبہ کے باوجود مال زکاۃ کے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جو قدر و منزلۃ ایک ہاشمی کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر حاصل ہے وہ اس مال دار کو حاصل نہیں۔ لہذا اس مال دار شخص کے حق میں اس شبہے کا خیال نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ : اور گردنوں کے آزاد کرنے میں مکاتب غلاموں کی مدد کی جائے گی۔ (اور مال زکاۃ میں سے انہیں مدد دے کر آزاد کر دیا جائے گا)۔ یہی نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے۔ (غلامی کا مسئلہ ابتداء اسلام میں در پیش تھا۔ اسلام نے آہستہ آہستہ غلامی کا داغ انسانیۃ کے ماتھے سے مٹا دیا تھا۔ چنانچہ یہ مد بھی آج کل معمول بہ نہیں رہی)۔

مسئلہ : غارم وہ شخص ہے جس پر قرض ہو اور وہ اس قدر نصاب کا مالک نہ ہو کہ نصاب اس کے قرض سے بڑھ جائے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غارم سے مراد وہ شخص ہے جو دو قبیلوں میں کشیدگی دور کرنے کے لیے صلح کرائے اور ان میں بھڑکتی ہوئی فتنے کی آگ کو بجھانے اور اس سلسلہ میں اس کو کچھ مالی تاوان ادا کرنا پڑے (گویا امام شافعیؒ کے نزدیک اصلاح بین الناس اور فتنہ کی آگ کو دور کرنے کے لیے مال زکاۃ میں سے خرچ کیا جا سکتا ہے)۔

مسئلہ : فی سبیل اللہ سے مراد وہ مجاھدین ہیں جن کے پاس جنگ کا ساز و سامان نہ ہو یہ رائے امام ابو یوسفؒ کی ہے ۔ کیونکہ آیۃ کے مطلق ہونے کی بناء پر یہی مفہوم واضح ہوتا ہے ۔

امام محمد ؒ کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس حج کرنے کی استطاعۃ یا زاد راہ نہ ہو ۔ امام محمد ؒ کی دلیل یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ اس پر حاجیوں کو سوار کرا کے ان کی منزل تک پہنچایا کرے ۔ لیکن ایسے غازی اور مجاھدین جو مال دار اور متمول ہوں ہمارے نزدیک ان کو زکاۃ نہیں دی جائے گی ۔ کیونکہ زکاۃ کا مصرف تو نادار لوگ ہیں ۔

مسئلہ : ابن سبیل سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس مال تو ہو لیکن اس کے اپنے وطن میں ہو اور وہ خود ایسے مقام پر ہو جہاں اس کے پاس کچھ نہ رہے ۔ زکاۃ کی یہ سب وہ صورتیں ہیں جو بیان کر دی گئی ہیں ۔ لھذا مالک کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو زکاۃ ادا کرے اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ کسی ایک صنف کو پوری زکاۃ ادا کر دے ۔

امام شافعی ؒ فرماتے ہیں کہ کسی ایک صنف کو زکاۃ کا ادا کرنا جائز نہ ہوگا ۔ بلکہ زکاۃ اسی صورۃ میں ادا ہوگی جب ان آٹھ اصناف میں سے ہر صنف کے کم از کم تین آدمیوں

کو زکاۃ دی جائے۔ کیونکہ للفقراء میں لام سے اضافۃ کی گئی ہے جو ان اصناف کا حق ثابت کرتا ہے (امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ الف لام جمع پر داخل ہے۔ جس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ تمام اصناف شامل کیے جائیں دوم یہ کہ جمع کے اقل فرد تین ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر صنف سے کم از کم تین آدمیوں کو دی جائے)۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ لام اضافۃ بیان کے لیے ہے۔ (یعنی یہ مصارف کی اقسام کی توضیح کرتا ہے کہ ان آٹھ قسم کے لوگوں کو زکاۃ دی جا سکتی ہے)۔ اس سے ان آٹھ اقسام کو زکاۃ کا لازمی مستحق قرار دے دینا ثابت نہیں ہوتا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ زکاۃ اللہ تعالی کا حق ہے اور لوگ غربت، ناداری اور افلاس کی بناء پر زکاۃ کے مصرف قرار پاتے ہیں۔ لہذا اس شخص کا لحاظ نہ رکھا جائے گا کہ نادار شخص کون ہے۔ (فقیر اور مسکین کوئی شخص اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ مقروض شخص وہی ہوتا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ غلام وہی ہوتا ہے جس کے قبضہ میں کچھ نہ ہو۔ مسافر کو زکاۃ اسی وقت دی جا سکتی ہے جب کہ وہ نادار ہو۔ غازی اور مجاہد اسی وقت زکاۃ کا مستحق ہوتا ہے جب وہ ساز و سامان سے محروم ہو۔ گویا کہ بنیادی طور پر زکاۃ کی ادائیگی کا اصل سبب ناداری اور غربۃ ہے۔ اس لیے اگر ایک ہی قسم کے نادار موجود ہوں تو ان کی زکاۃ سے اعانۃ کی جائے گی تمام اصناف کا تلاش کرنا ضروری

نہیں) اور ہمارا یہ موقف اس بناء پر ہے کہ حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ سے یہی طریق منقول ہے ۔

مسئلہ : زکاۃ کا کسی ذمی کو ادا کرنا جائز نہیں ، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ کو ارشاد فرمایا تھا کہ زکاۃ مسلمانوں کے مال داروں سے وصول کی جائے اور ان کے فقراء میں تقسیم کی جائے ۔ زکاۃ کے علاوہ دوسرے نفلی صدقات ذمی کو دیے جا سکتے ہیں ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نفلی صدقات بھی ذمیوں کو نہیں دیے جا سکتے ۔ امام شافعیؒ کی اس رائے کی امام ابو یوسفؒ نے بھی تائید کی ہے اور انہوں نے نفلی صدقات کو بھی زکاۃ پر قیاس کیا ہے ۔ (کہ جس طرح زکاۃ کا مصرف ذمی نہیں بن سکتا اسی طرح دیگر صدقات بھی اسے نہیں دیے جا سکتے) ۔

ہماری دلیل نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مختلف مذہب و ملۃ کے محتاجوں کو صدقے دیا کرو ۔ اگر حضرت معاذؓ والی حدیث نہ ہوتی تو غیر مسلموں میں حاجت مندوں کو زکاۃ دینا بھی جائز ہوتا ۔

مسئلہ : زکاۃ کی رقم سے مسجد تعمیر نہیں کی جا سکتی اور نہ کسی میت کی تجہیز و تکفین ہی ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ اس میں تملیک یعنی مالک بنانا مفقود ہے ۔ جب کہ تملیک زکاۃ کی ادائیگی کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے ۔

مسئلہ : زکاۃ کے مال سے کسی مرنے والے کا قرض نہیں ادا کیا جا سکتا ۔ کیونکہ کسی شخص کا قرض ادا کرنا

اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پہلے اسے اس مال کا مالک بنایا جائے اور خصوصاً مردے کی صورۃ میں یہ امید نہیں کی جا سکتی (مردہ شخص کا قرض اس کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیے ۔ اگر وہ مال دار ہیں تو اپنے پاس سے ادا کریں یا اگر مرنے والا خود مال دار تھا تو اس کے مال سے ادا کیا جائے۔ اگر وارث غریب ہوں اور مرنے والا بھی کچھ چھوڑ کر نہ گیا ہو تو ایسی صورۃ میں ان وارثوں کو زکاۃ دی جا سکتی ہے۔ اور وہ زکاۃ وصول کرنے کے بعد اپنی جانب سے مرنے والے کا قرض ادا کر سکتے ہیں) ۔

مسئلہ : زکاۃ کے مال سے کسی غلام کو خرید کر آزاد نہیں کیا جائے گا ۔ اس میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے ۔ انہوں نے اللہ تعالی کے ارشاد "وفی الرقاب"، سے یہ معانی مراد لیے ہیں کہ غلام کو خرید کر آزاد کیا جا سکتا ہے ۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ غلام کا آزاد کرنا تو ملکیۃ کا ساقط کرنا ہے نہ کہ اس کو زکاۃ کا مالک بنانا ۔ (اور جب اس کو مالک زکاۃ نہ بنایا گیا تو زکاۃ کی تملیک ثابت نہ ہوئی اس لیے ادائیگی درست نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : زکاۃ کسی مال دار کو دینا جائز نہیں ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ کسی مال دار شخص کو صدقہ لینا جائز نہیں اور نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مطلق ہونے کی بناء پر امام شافعیؒ پر حجۃ ہے ۔ جن کے نزدیک مال دار غازیوں کو زکاۃ دی جا سکتی ہے ۔ (احناف

کے نزدیک مال دار مجاہدین کو زکاۃ دینا جائز نہیں ۔ کیونکہ زکاۃ کا مقصد ہی مفلس اور نادار لوگوں کی اعانۃ ہے) ۔ اس کی تائید حضرت معاذؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ۔

مسئلہ : کوئی زکاۃ دینے والا شخص اپنے باپ یا دادا کو یا اس سے اوپر یہ سلسلہ کہیں تک چلا جائے یا اپنے بیٹے کو یا پوتے کو یا نیچے تک یہ سلسلہ کہیں تک چلا جائے زکاۃ نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ جائیداد سے یا مختلف املاک سے نفع حاصل کرنا ان میں مشترک ہے ۔ اس بناء پر تملیک (دوسرے کو زکاۃ کے مال کا مالک بنانا) پورے طور پر ثابت نہیں ہوتی ۔

مسئلہ : کوئی شخص اپنی بیوی کو زکاۃ نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ عام طور پر دونوں مال سے نفع اٹھانے میں شریک ہوتے ہیں ۔

مسئلہ : کوئی بیوی اپنے شوہر کو زکاۃ نہیں دے سکتی ۔ یہ امام اعظمؒ کی رائے ہے اس کی دلیل وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں ۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ بیوی شوہر کو زکاۃ دے سکتی ہے ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے ۔ اے عورت تیرے لیے دو اجر ہیں ، ایک تو صدقہ دینے کا اجر اور دوسرا صلہ رحمی کا اجر، یہ بات نبی ﷺ نے عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی کو ارشاد فرمائی جب اس نے آپ سے یہ استفسار کیا کہ آیا وہ اپنے شوہر کو صدقہ ادا کر دے یا نہیں ۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ یہاں صدقہ سے مراد زکاۃ نہیں بلکہ نفلی صدقہ ہے ۔

مسئلہ : کوئی شخص اپنے مدبر یا اپنے مکاتب یا اپنی اُم ولد کو زکاۃ نہیں دے سکتا ۔ کیونکہ اس میں تملیک مفقود ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلام کی کمائی اس کے آقا کی ملکیۃ ہوتی ہے ۔ رہا مکاتب کا معاملہ تو اس میں یعنی اس کی کمائی میں آقا کو ایک قسم کا حق حاصل ہوتا ہے ۔ (مثلاً مکاتب اپنی کمائی میں سے بغیر آقا کی اجازۃ لیے مکان نہیں بنا سکتا کوئی غلام خرید کر آزاد نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ) لہذا یہ تملیک مکمل نہیں ہوگی ۔

مسئلہ : کوئی شخص اپنے اس غلام کو زکاۃ نہیں دے سکتا ۔ جس کا کچھ حصہ آزاد کر دیا ہو یہ رائے امام اعظمؒ کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ غلام مکاتب کی طرح ہے ۔

صاحبینؒ کہتے ہیں کہ ایسے غلام کو زکاۃ ادا کرنا جائز ہے ۔ ان کے نزدیک یہ غلام آزاد ہوگا ، البتہ مقروض شمار ہوگا (صاحبینؒ نے اس مسئلہ کو طلاق پر قیاس کیا ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنی بیوی کے کسی ایک حصے کو طلاق دے تو یہ طلاق پورے جسم پر جاری ہوگی اسی طرح جب اس نے غلام کے کسی حصے کو آزاد کر دیا تو اس سے پورا غلام آزاد ہو جائے گا اور باقی حصے کی قیمۃ بطور قرض اس کے ذمہ واجب ہوگی ۔ امام اعظمؒ کے نزدیک غلام قابل تقسیم

ہے ۔ لہذا اس کے بعض حصے کے غلام ہونے پر اس کو تملیک ممکن نہیں ۔ اس لیے زکاۃ ادا نہ ہوگی) ۔

مسئلہ : مال دار آدمی کے غلام کو بھی زکاۃ نہیں دی جا سکتی ۔ کیونکہ غلام کا سب کچھ مالک کا ہوتا ہے (تو جس طرح مال دار کو زکاۃ نہیں دی جا سکتی ۔ اس کے غلام کو بھی نہیں دی جا سکے گی) ۔

مسئلہ : کسی مال دار کے بچے کو زکاۃ نہیں دی جاسکتی جب کہ بچہ چھوٹا ہو ۔ کیونکہ چھوٹا بچہ اپنے والد کے مال دار ہونے کی بناء پر مال دار ہی شمار کیا جاتا ہے ۔ بخلاف اس صورۃ کے جب کہ وہ بڑا ہو اور نادار ہو ۔ کیونکہ اس صورۃ میں والد کے متمول ہونے کی بناء پر لڑکے کو غنی شمار نہیں کیا جائے گا اور والد سے نفقے کے حاصل کرنے سے اس پر مال دار کا اطلاق نہیں ہو سکتا ۔ بخلاف مال دار شخص کی عورت کے کہ اگر وہ فقیر ہو تو خاوند کے متمول ہونے کی صورۃ میں اسے غنیہ شمار نہیں کیا جا سکتا ۔ (البتہ اس کا نفقہ خاوند کے ذمہ ہوتا ہے لیکن) اسے نفقہ لینے کی مقدار کی بناء پر غنیہ نہیں کہا جا سکتا ۔

مسئلہ : بنو ہاشم یعنی سادات کو زکاۃ نہیں دی جا سکتی ۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : اے بنی ہاشم ! بے شک اللہ تعالی نے تم پر لوگوں کی میل کچیل حرام فرما دی ہے اور اس کے بدلے تمھیں خمس عطا کیا ہے (کیونکہ زکاۃ کی صورۃ میں زکاۃ کی حیثیۃ اس پانی کی سی ہے جو فرض مثلا غسل

یا وضو کے ساقط ہونے سے میلا اور مستعمل ہو جاتا ہے) .

جہاں تک نفلی صدقات کا تعلق ہے ان کی حیثیۃ اتنی ہے کہ پانی کو قربۃ یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے (حدث کے بعد وضو کرنے سے پانی مستعمل ہو جاتا ہے جس سے پھر طھارۃ حاصل نہیں کی جا سکتی . اگر وضو پہلے موجود ہو دوبارہ محض ثواب کی یا ٹھنڈک حاصل کرنے کی غرض سے وضو کر لیا جائے تو اس پانی سے طھارۃ حاصل کی جا سکتی ہے . پہلی مثال زکاۃ کی ہے اور دوسری نفلی صدقات کی ہے) .

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ بنو ھاشم سے مراد حضرت علیؓ ، عباسؓ ، جعفرؓ ، عقیلؓ اور حارثؓ ابن عبدالمطلب کی اولاد ہیں . ان سب کے آزاد کردہ غلام بھی اسی حکم میں شامل ہیں . جہاں تک ان کی اولاد کا تعلق ہے . (تو انہیں زکاۃ اس وجہ سے نہیں دی جا سکتی) کہ ھاشم بن عبد مناف کی طرف منسوب ہیں اور قبیلے کی نسبۃ ھاشم بن عبد مناف کی طرف کی جاتی ہے .

جہاں تک ان کے آزاد کردہ غلاموں کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ روایۃ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام نے آپ سے استفسار کیا . کیا میرے لیے صدقہ لینا جائز ہے ؟ آپ نے فرمایا : نہیں تم ہمارے آزاد کردہ غلام ہو . (سوال ۔ آزاد کردہ غلاموں کو بھی بنی ھاشم کے حکم میں کیسے شامل کیا گیا . جب کہ قریشی کا آزاد کردہ غلام اس کے حکم میں شامل نہیں ہوتا . کیونکہ غلام سے جزیہ لیا جا

سکتا ہے ۔ صاحب ہدایہ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (اگر کسی قریشی نے اپنے نصرانی غلام کو آزاد کیا ، تو اس غلام سے جزیہ لیا جائے گا اور آزاد کردہ شخص کی حالۃ کا اعتبار کیا جائے گا ۔ (کہ اگر آزاد کردہ غلام کافر ہو تو جزیہ لیا جائے گا اور اگر مسلمان ہو تو جزیہ نہ لیا جائے گا) ۔ کیونکہ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ (کہ آزاد کردہ شخص کی حالۃ کا اعتبار ہو اور آزاد کردہ غلام کو مالک کے حکم میں شامل کرنا نص سے ثابت ہے) ۔ ورنہ قیاس تو یہ تھا کہ بنی ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں کو صدقہ لینا جائز ہوتا) اور یہ نص صرف صدقے کے ساتھ خاص ہے ۔ (یعنی بنی ہاشم کے موالی صرف منع صدقہ ہی میں ان کے حکم میں شامل ہوں گے باقی احکام میں نہیں) ۔

مسئلہ : امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو زکاۃ ادا کرے اور یہ گمان ہو کہ وہ نادار ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ زکاۃ لینے والا شخص امیر یا ہاشمی یا کافر ہے یا اس نے اندھیرے میں زکاۃ ادا کی بعد میں ظاہر ہوا کہ زکاۃ لینے والا اس کا باپ یا بیٹا ہے تو زکاۃ دینے والے کو اعادے کی ضرورۃ نہیں ۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں اس پر لازم ہے کہ دوبارہ زکاۃ ادا کرے ۔ کیونکہ اس کی غلطی یقینی طور پر ظاہر ہوگئی ہے ۔ نیز ان اشیاء یا اشخاص سے واقفیۃ اور آگاہی

ممکن ہے اور اس مسئلے کی حیثیۃ وہی ہے ۔ جیسا کہ برتنوں اور کپڑوں کے غلط استعمال پر (اگر کسی شخص نے غلطی سے ناپاک برتن یا ناپاک کپڑے استعمال کرکے نماز پڑھ لی ، مگر نماز کے بعد اسے اپنی غلطی کا پتا چل گیا تو اس پر نماز کا لوٹانا لازم ہے ، اسی طرح جو زکاۃ غلطی سے غیر مستحق کو دی جائے تو علم ہونے پر دوبارہ دینا ہوگی) ۔

طرفین[رح] کی دلیل معن بن یزید[رض] کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اے یزید ! تجھے وہ اجر و ثواب حاصل ہوگیا جس کی تم نے نیت کی تھی اور معن[رض] تو نے جو لیا وہ تیرے لیے جائز ہے"۔ مسئلے کی صورۃ یہ تھی کہ معن کے باپ کے وکیل نے غلطی سے باپ کی زکاۃ بیٹے کو دے دی تھی ۔

طرفین[رح] کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ان امور سے آگاہی و واقفیۃ فقط اجتہاد سے ممکن ہے یقینی طور پر نہیں۔ لہذا مسئلہ کی بنیاد اس بات پر رکھی جائے گی کہ زکاۃ دینے والے کا خیال زکاۃ دیتے وقت کیا تھا ۔ (یعنی اس نے زکاۃ دیتے وقت کوشش و اجتہاد سے جو امر معلوم کیا تھا اسی پر مدار ہوگا) بلکہ اس مسئلے کی صورۃ ایسی ہی ہے جیسے کسی شخص پر قبلہ کی سمت مشتبہ ہو جائے ۔ (اگر کسی شخص نے اپنی کوشش کے مطابق سمت قبلہ کا تعین کر لیا اور اپنے خیال کے مطابق درست سمت کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ لی مگر بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تو اب اسے نماز لوٹانے کی ضرورۃ نہیں ۔

اسی طرح زکاۃ دینے والے نے بھی اپنی امکانی کوشش صرف کر کے زکاۃ ادا کر دی مگر بعد میں مصرف غیر مستحق ثابت ہونے کی صورۃ میں اعادہ نہ ہوگا) امام اعظمؒ سے ایک اور رائے منقول ہے کہ امیر شخص کے علاوہ یہ زکاۃ جائز نہیں ہوگی . لیکن مشہور موقف وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے (کہ زکاۃ کے لوٹانے کی ضرورۃ نہیں) .

اور مسئلہ کی یہ صورۃ تب ہے جب کہ زکاۃ دینے والا شخص تحرّی سے کام لے. (تحری سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی امکانی کوشش سے کام لے کر کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرے) اگر کسی شخص نے تحری سے کام لیا اور زکاۃ ادا کر دی اور اس کے غالب گمان کے مطابق لینے والا شخص واقعی مستحق تھا (تو یہ زکاۃ ادا ہوگئی اب اسے لوٹانے کی ضرورۃ نہیں) .

البتہ اگر زکاۃ دینے والے کو شک گزرا اور شک کے باوجود تحری سے کام نہیں لیا یا تحری تو کی مگر ساتھ ہی زکاۃ بھی ادا کر دی اور اس کے غالب گمان میں زکاۃ لینے والا اس کا صحیح مصرف نہیں تو زکاۃ کی ادائیگی کافی نہ ہوگی . البتہ اگر اسے اس بات کا علم ہو کہ لینے والا نادار ہے تو زکاۃ کا یہ دینا درست ہوگا .

مسئلہ : اگر کسی شخص نے کسی کو زکاۃ ادا کی ، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص اس کا غلام یا مکاتب ہے تو زکاۃ کی ادائیگی جائز نہ ہوگی . کیونکہ اس میں تملیک مفقود

ہے کیونکہ دونوں میں مالک کی اھلیۃ موجود نہیں اور تملیک زکاۃ کی ادائیگی کا ایک رکن ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔

مسئلہ: زکاۃ کسی ایسے شخص کو ادا کرنا جائز نہیں جو نصاب کا مالک ہو خواہ یہ نصاب کسی بھی مال کا کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعۃ نے نصاب کو مال دار ہونے کا ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ یہ نصاب حوائج اصلیہ سے زائد ہو۔

(سوال - آپ نے صرف نصاب کو شرط قرار دیا ہے نامی یا غیر نامی کی تفریق نہیں کی۔ جب کہ زکاۃ کے وجوب کے لیے مال نامی ہونا شرط ہے۔ صاحب ھدایۃ جواب میں فرماتے ہیں) کہ نما کی شرط وجوب زکاۃ کے لیے ہے۔ (یعنی زکاۃ تب واجب ہوتی ہے جب مالک نصاب ہو اور مال بھی نامی ہو۔ مگر مذکورہ صورۃ میں نما اس لیے شرط قرار نہیں دی گئی کہ یہ نصاب حرمۃ صدقہ کا سبب بنتا ہے اس لیے نصاب مال نامی ہو یا نہ ہو۔ صاحب نصاب کو صدقہ لینا حرام ہوگا)۔

مسئلہ: زکاۃ کسی ایسے شخص کو ادا کرنا جائز ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو۔ اگرچہ وہ شخص تندرست اور کمانے والا ہو۔ اس کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ زکاۃ لینے والا شخص نادار ہے اور فقراء زکاۃ کا صحیح مصرف ہیں۔ اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ کسی شخص کے محتاج ہونے کی حیثیۃ سے عام طور پر آگاہی نہیں ہوتی۔ لہذا زکاۃ کے مستحق

ہونے کا مدار اس کی دلیل کو ٹھیرایا جائے گا اور وہ دلیل یہ ہے کہ اس کے پاس نصاب موجود نہیں۔

مسئلہ : ایک ہی شخص کو زکاۃ کے دو سو درہم یا زائد دے دینا اگرچہ مکروہ ہے تاہم جائز ہوگا۔ امام زفرؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ امیری زکاۃ کی ادائیگی سے متصل ہے۔ لہذا یہ زکاۃ گویا کہ امیر شخص ہی کو دی گئی۔ (یعنی جونہی زکاۃ ادا کرتے جائیں گے صدقہ لینے والا کامل نصاب کا مالک ہو جانے کی وجہ سے شرعی طور پر امیر شمار ہوگا۔ تو گویا زکاۃ امیر کر دی گئی اس لیے جائز نہ ہوگا)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ تونگری کا لحاظ ادا کرنے سے پہلے ہوتا ہے اور مذکورہ بالا صورۃ میں تونگری ادائیگی کے بعد آتی ہے۔ البتہ یہ مکروہ اس بناء پر ہے کہ تونگری اور ادائیگی میں قرب اور اتصال ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص نماز ادا کرے اور قریب ہی نجاست پڑی ہو۔ (نماز اگرچہ ادا ہو جائے گی مگر نجاست کی وجہ سے مکروہ ہوگی)۔

مسئلہ : امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ زکاۃ کی مقدار اگر اس قدر ہو کہ انسان مستغنی ہو جائے تو میں اس کو زیادہ پسندیدہ خیال کرتا ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے مستغنی ہو جائے ہاں البتہ مطلق طور پر مستغنی بنا دینا یعنی انسان کو صاحب نصاب بنا دینا مکروہ ہے۔

مسئلہ : ایک شہر کی زکاۃ دوسرے شہر میں لے جانا مکروہ ہے بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ایک گروہ کی زکاۃ انھیں میں تقسیم کر دی جائے ۔ جیسا کہ ہم حضرت معاذؓ کی حدیث بیان کر چکے ہیں (کہ ان کے اغنیاء سے وصول کی جائے اور ان کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے) نیز اس کی عقلی توجیہ یہ ہے کہ اس میں ہمسائیگی کے حقوق کی رعایۃ موجود ہے ۔

البتہ اگر کوئی شخص دوسرے شہر میں آباد اپنے رشتہ داروں کو زکاۃ منتقل کر دے یا کسی ایسی قوم کے افراد کو ارسال کر دے جو اس کے شہر کے لوگوں سے زیادہ محتاج ہیں (تو ایسا کرنا جائز ہے) کیونکہ پہلی صورۃ میں صلہ رحمی پائی جاتی ہے اور دوسری صورۃ میں زیادہ محتاج لوگوں کی حاجۃ براری موجود ہے ۔ تاہم اگر کسی شخص نے ان کے علاوہ بھی زکاۃ منتقل کر دی تو یہ جائز ہوگا اگرچہ مکروہ ہے ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نص قرآنی سے مطلق فقیر کے مستحق زکاۃ ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ (خواہ اپنے شہر کے ہوں یا دوسرے شہر کے) ۔

واللہ تعالی أعلم بالصواب

بَابُ صَدَقَةِ الفِطْر

صدقہ فطر کا بیان

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں کہ صدقۂ فطر ہر آزاد مسلمان پر واجب ہے . جب کہ وہ اس قدر نصاب کا مالک ہو جائے کہ وہ نصاب اس کی رہائش ، اس کے پہننے اور استعمال کرنے کے کپڑوں ، گھر کے ساز و سامان ، سواری کے جانوروں ، ہتھیاروں اسلحہ اور خدمت کے غلاموں سے زائد ہو . جہاں تک صدقۂ فطر واجب ہونے کا تعلق ہے . وہ اس بناء پر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عیدالفطر کے خطبہ میں ارشاد فرمایا . ہر آزاد، غلام چھوٹا ہو یا بڑا اس کی طرف سے نصف صاع گندم یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر کے طور پر ادا کیے جائیں . یہ روایت ثعلبہ بن صغیر العدولی سے منقول ہے اور اس قسم کی خبر واحد سے صدقہ فطر کا واجب ہونا ثابت ہوگا . فرض نہیں (کیونکہ خبر واحد خبر متواتر کی طرح قطعی اور یقینی نہیں ہوتی) .

حریۃ کی شرط اس لیے عائد کی گئی ہے تا کہ تملیک ثابت ہو جائے اور اسلام کی شرط اس لیے تا کہ یہ عبادۃ شمار ہو اور

تونگر ہونا اس لیے شرط قرار دیا گیا کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : جب تک کوئی شخص مال دار نہ ہو اس کو صدقہ دینا واجب نہیں ہوتا. اور آپ کا یہ ارشاد امام شافعیؒ پر حجة ہے ، جو یہ تجویز فرماتے ہیں کہ صدقہ فطر ہر اس شخص پر واجب ہے ، جس کے پاس اپنے اور اپنے اهل و عیال کے زاد و خوراک سے ایک دن کی خوراک سے بھی کچھ زائد ہو . اور احناف نے تونگری کا اندازہ نصاب پر اس لیے کیا ہے کیونکہ شریعة اسلامیہ میں یہی ایک اندازہ یا معیار مال دار ہونے کا معروف ہے .

حوائجُ اصلیہ سے زائد ہونے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا اشیاء دراصل مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہیں ۔ اور وہ تمام اشیاء جو حوائجُ اصلیہ کو پورا کر رہی ہوں نہ ہونے کے برابر ہیں . (لهذا انہیں نصاب میں شمار نہیں کیا جائے گا) .

صدقۂ فطر کے لیے مال نامی ہونا شرط نہیں اور اس قسم کے نصاب سے تین باتیں متعلق ہوں گی. اس قسم کے نصاب کا مالک صدقہ یعنی زکاۃ لینے سے محروم رہتا ہے . اس پر قربانی واجب ہوتی ہے اور اس پر صدقۂ فطر کی ادائیگی واجب ہوتی ہے .

مسئلہ : ہر مسلمان شخص اپنی جان کا صدقۂ فطر ادا کرے . اس کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ہر مرد اور عورت پر صدقۂ فطر واجب قرار دیا .

مسئله : ہر شخص اپنی چھوٹی اولاد کی جانب سے صدقۂ فطر ادا کرے گا . کیونکہ صدقۂ فطر کے واجب ہونے کا اصلی سبب وہ فرد ہے جس کی کفالت کا بار اس کے کندھوں پر ہے کیونکہ صدقے کی نسبت فرد کی طرف کی گئی ہے اور یہ کہا جاتا ہے : زكاة الرأس یعنی سر کی زکوٰۃ اور یہ (اضافۃ) سببية کی علامت ہے . (بعض اوقات اضافۃ سببية کی حامل ہوتی ہے جیسا کہ صيام شہر رمضان اور صلاة الظهر یہی کیفیۃ زکاۃ الرأس کی اضافۃ کی ہے تو اس سے مراد فرد پر واجب ہونے والی زکاۃ ہے اس زکاۃ کا تعلق مال سے نہیں بلکہ فرد سے ہے اور فرد ہی صدقہ کے واجب ہونے کا اصل سبب ہے) .

جہاں تک اسے فطر کی طرف مضاف یا منسوب کرنے کا تعلق ہے تو وہ اس بناء پر ہے کہ یوم الفطر اس کی ادائیگی کا وقت ہے . اس لیے صدقۂ فطر میں افراد کے متعدد ہونے سے اتنے گنا اضافہ ہو جاتا ہے . جب کہ یوم الفطر ایک ہی ہوتا ہے دراصل صدقہ فطر واجب ہونے کا سبب فرد ہی ہے ، جس کی کفالۃ اور پرورش کی ذمہ داریاں صاحب نصاب کے دوش پر ہوتی ہیں نیز اسے ان پر حق ولایۃ حاصل ہوتا ہے . لہذا ان افراد کو جن پر اس مفہوم کا اطلاق ہوتا ہے صاحب نصاب کے ساتھ شامل کیا جائے گا . مثلاً اس کے چھوٹے بچے ہیں جن کی کفالۃ کا بوجھ اس کے ذمے ہوتا ہے اور اسے ان پر حق ولایۃ حاصل ہوتا ہے .

مسئلہ : ہر صاحب نصاب اپنے غلاموں کا صدقہ فطر بھی ادا کرے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی کفالة بھی کرتا ہے اور ان پر حق ولایة بھی حاصل ہے ۔ البتہ یہ صدقہ اسی صورة میں واجب ہوگا ۔ جب کہ یہ غلام خدمة کے لیے ہوں (تجارة کے لیے نہ ہوں) اور چھوٹے بچوں کا اپنا مال نہ ہو ۔ اگر ان کے پاس اپنا ذاتی مال موجود ہو تو اس صورة میں شیخینؒ کے نزدیک ان کے مال سے صدقۂ فطر ادا کیا جائے گا ۔ اس میں امام محمدؒ کا اختلاف ہے ۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ شریعة نے صدقۂ فطر کی حیثیة ایک مالی مشقة کی رکھی ہے ۔ پس یہ نفقہ کے مشابہ ہوگا (اگر صغیر کا اپنا ذاتی مال ہو تو اس کے اخراجات اس کے اپنے مال سے ادا کیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح صدقہ بھی اس کے اپنے مال سے ادا کیا جائے گا) ۔

مسئلہ : کوئی صاحب نصاب شخص اپنی بیوی کی طرف سے صدقۂ فطر ادا نہیں کرے گا ، کیونکہ اس کی بیوی پر حق ولایة کامل طور پر حاصل نہیں ۔ نیز وہ اس کی کفالة کا پورا بوجھ اٹھانے کا ذمہ دار نہیں اس کی توجیہ یہ ہے کہ شوہر کو ان حقوق کے علاوہ جو اسے نکاح کی صورة میں حاصل ہیں ، بیوی پر حق ولایة حاصل نہیں ہے ۔ دوسرے وہ ان اخراجات کے علاوہ جو اس نکاح کی وجہ سے عائد ہوتے ہیں ، بیوی کے دیگر اخراجات کا ذمہ دار نہیں ۔ مثلاً علاج معالجہ پر خرچ کرنا (شوہر کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ بیوی

کے علاج معالجے پر خرچ کرے ۔ لیکن مہر نفقہ اور سکنی وغیرہ کی ادائیگی کے بعد وہ قانونی لحاظ سے دیگر اخراجات کا پابند نہیں ہوتا) ۔

مسئلہ : کوئی شخص اپنی بڑی اولاد کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنے کا ذمہ دار نہیں ۔ اگرچہ وہ اس کی پرورش میں ہوں ، کیونکہ اسے ان پر حق ولایۃ نہیں تاہم اگر اس نے بڑی اولاد کی طرف سے یا اپنی بیوی کی جانب سے بغیر ان کے کہے صدقۂ فطر ادا کر دیا تو استحساناً جائز ہوگا ۔ کیونکہ عادۃً ان سے اجازۃ ثابت ہے ۔

مسئلہ : اور نہ ہی اپنے مکاتب کی طرف سے ادا کرے کیونکہ اس پر ولایۃ مفقود ہے اور نہ ہی مکاتب اپنی طرف سے ادا کرے ۔ کیونکہ وہ نادار ہے ، البتہ مدبر اور أم ولد میں آقا کا حق ولایۃ ثابت ہے ، لہذا ان کی طرف سے وہ صدقۂ فطر ادا کرے گا ۔

مسئلہ : کوئی شخص اپنے غلاموں کی طرف سے صدقۂ فطر ادا نہیں کرے گا جو تجارۃ کے لیے ہوں ۔

امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک صدقہ فطر کا وجوب صاحب نصاب پر نہیں ، بلکہ غلام پر ہوتا ہے اور زکاۃ آقا پر واجب ہوتی ۔ لہذا دونوں کے واجب ہونے میں کوئی تصادم و تعارض نہیں ۔

ہمارے نزدیک صدقۂ فطر بھی آقا پر واجب ہوتا ہے اس کا وہی مذکورہ سبب ہے (یعنی زکاۃ الرأس وھو یمونہ ویلی

علیہ) جیسا کہ صاحب نصاب پر زکاۃ واجب ہوتی ہے (لہذا تجارۃ کے غلاموں پر صدقہ واجب کرنے سے) صدقہ میں تکرار لازم آئے گا۔ (اور یہ جائز نہیں کہ آقا تجارۃ کے غلاموں کی زکاۃ بھی ادا کرے اور ان کا صدقۂ فطر بھی دے ، کیونکہ اگر غلاموں کے علاوہ دوسرا سامان تجارۃ ہوتا تو فقط زکاۃ ہی ادا کرنا پڑتی۔ اگر امام شافعیؒ کے قول کے مطابق ان غلاموں پر صدقۂ فطر بھی واجب قرار دیا جائے تو مالک کو دوہرا صدقہ دینا پڑتا ہے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: لا ثنی فی الصدقۃ یعنی صدقہ سال میں دو بار نہ لیا جائے)۔

مسئلہ: اگر ایک غلام دو مالکوں میں مشترک ہو تو کسی پر بھی صدقۂ فطر واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ حق ولایۃ مکمل طور پر کسی ایک کو بھی حاصل نہیں اور نہ کفالۃ کا بار ہی کسی ایک کے ذمہ ہے۔

مسئلہ: اگر دو مالکوں کے درمیان بہت سے غلام مشترک ہوں۔ تو امام اعظمؒ کے نزدیک مسئلہ کی صورۃ یہی رہے گی۔ (کہ کسی مالک پر غلاموں کا صدقہ فطر واجب نہ ہوگا)۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک پر اپنے اپنے حصے کے افراد کا صدقۂ فطر واجب ہوگا۔ البتہ کسروں کو چھوڑ دیا جائے گا۔ (مثلاً اگر کسی شخص کے پاس سات غلام ہیں جن میں دوسرا بھی شریک ہے تو امام اعظمؒ کے نزدیک کسی مالک پر بھی صدقۂ فطر واجب نہ ہوگا۔ لیکن صاحبینؒ کے نزدیک دونوں پر تین تین غلاموں کا صدقۂ فطر

واجب ہوگا اور ایک غلام مذکورہ بالا صورۃ کے مطابق اس سے مستشنٰی قرار پائے گا) .

اس مسئلے کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک غلام قابل تقسیم نہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک ان کی تقسیم عمل میں لائی جا سکتی ہے . بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ مسئلہ تمام ائمہ کے نزدیک متفق علیہ ہے (یعنی کسی مالک پر بھی صدقہ واجب نہ ہوگا) کیونکہ تقسیم سے پہلے کسی ایک مالک کا حصہ متعین نہیں ہوتا . اس لیے کسی کی ملکیۃ بھی پورے طور پر نہیں پائی جاتی .

مسئلہ : ایک مسلمان صاحب نصاب اپنے کافر غلام کی طرف سے بھی صدقۂ فطر ادا کرے گا . کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا بیان کردہ ارشاد مطلق ہے نیز آپ کا ایک اور ارشاد بھی ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ صدقۂ فطر ہر آزاد یا غلام کی طرف سے خواہ یہودی ہو، نصرانی ہو یا مجوسی ہو ادا کرو .

نیز اس کا سبب ثابت ہے (یعنی الرأس الذی یمونه ویلی علیه) اور آقا صدقۂ فطر ادا کرنے کا اہل ہے اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے . کیونکہ ان کے نزدیک صدقۂ فطر آقا پر نہیں بلکہ غلام پر واجب ہوتا ہے اور غلام غیر مسلم ہونے کی بناء پر اس کا اہل نہیں .

البتہ اگر صورۃ برعکس ہو تو متفقہ طور پر واجب نہ ہوگا (مثلاً مالک غیر مسلم ہو اور غلام مسلمان ہو تو اس صورۃ میں سب کے نزدیک صدقۂ فطر واجب نہیں ہوگا) .

مسئلہ : مصنفؒ فرماتے ہیں اگر کسی شخص نے غلام کو فروخت کر دیا اور بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو اس سودے کے فسخ کرنے کا اختیار ہے تو اس صورة میں صدقۂ فطر اس شخص پر واجب ہوگا ۔ جس کی طرف یہ غلام منتقل ہو جائے گا ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ سودا ہو چکنے کے بعد عید کا دن گزر جائے اور ابھی تک خیار باقی ہو ۔

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ صدقۂ فطر اس شخص پر واجب ہوگا جس کو سودے میں خیار حاصل ہے کیونکہ حق ولایة اسی کے پاس ہے ۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صدقۂ فطر اس شخص پر واجب ہوگا جس کی ملکیة ہے ، کیونکہ یہ اس کے واجبات میں سے ہے ، جیسے کہ نفقے کا ادا کرنا اس پر لازم ہے ۔

احناف کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر ملکیة موقوف ہے ، لہذا اگر وہ بائع کے ہاں لوٹ جائے تو اس کی ملکیة شمار ہوگا اور اگر یہ سودا طے ہو جائے تو خریدار کی ملکیة ثابت ہو جائے گی اور اس وقت سے ہوگی جب سے یہ سودا طے پایا تھا ۔ لہذا مذکورہ مسئلے میں توقف کیا جائے گا ۔ تاکہ اس کا فیصلہ اس کے انجام پر مرتب کیا جائے نفقے کی صورة اس سے مختلف ہے ۔ کیونکہ وہ تو انسان کی فوری ضرورت پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ لہذا وہاں توقف کرنا مقبول نہ ہوگا ۔ ائمہ کے درمیان تجارة کی زکاة کے سلسلے میں اسی قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے ۔

فَصْلٌ فِي مِقْدَارِ الْوَاجِبِ وَوَقْتِهِ

صدقۂ فطر کی مقدار اور اس کے وقت کا بیان

صدقۂ فطر کی مقدار نصف صاع گندم ، آٹا یا ستّو یا کشمش ہے . کھجور اور جو کی صورۃ میں صدقۂ فطر کی مقدار مکمل صاع ہوگی . صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ کشمش جو کی مانند ہے (لہذا کشمش کا بھی پورا صاع ادا کیا جائے گا) یہی رائے امام اعظمؒ سے بھی نقل کی گئی ہے . لیکن پہلی روایۃ جامع صغیر کی ہے (جس میں کشمش کی مقدار صدقۂ نصف صاع ہے) .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان سب مذکورہ بالا اشیاء میں صدقۂ فطر کامل صاع ادا کرنا چاہیے . اس کی دلیل ابو سعید الخدریؓ کی وہ حدیث ہے جس میں فرمایا : ہم دور رسالت میں اسی طرح (یعنی کامل صاع) ادا کیا کرتے تھے .

ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی ثعلبہ بن حصیر عدی کی روایۃ) یہی عمل صحابہ کرامؓ کی ایک جماعۃ کا بھی تھا . جن میں خلفاء راشدین بھی شامل تھے . اور جہاں تک امام شافعیؒ کی بیان کردہ روایۃ کا تعلق ہے تو وہ صدقۂ فطر کی اس زیادتی پر محمول ہے جو صحابۂ کرامؓ نفلی طور پر ادا کیا کرتے تھے .

کشمش کے سلسلے میں صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ کشمش اور کھجور اپنے مقصد کے اعتبار سے ایک دوسرے

سے ملتے جلتے ہیں (لہذا کھجور کی طرح کشمش کا بھی کامل صاع ادا کیا جائے گا) .

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ کشمش اور گندم معنوی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں . کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے پورے اجزاء کے ساتھ کامل طور پر کھانے میں آتی ہے . لیکن جو اور کھجور کی صورۃ مختلف ہے ، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا کچھ حصہ کھایا جاتا ہے اور کھجور سے گٹھلی اور جو سے بھوسی پھینک دی جاتی ہے . لہذا گندم اور کھجور میں صدقۂ فطر میں جو فرق روا رکھا گیا ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے .

آٹے اور ستّو سے مراد وہ آٹا اور ستو ہیں جو گندم سے بنائے جائیں . اگر آٹا جو کا ہو تو حیثیت جو کی ہوگی (اور پورا صاع صدقۂ فطر میں دینا پڑے گا) .

افضل یہ ہے کہ آٹے ستو اور گنام کی مقدار اور قیمت میں احتیاط سے کام لیا جائے . اگرچہ بعض احادیث میں آٹے کا ذکر موجود ہے لیکن امام محمدؒ نے اپنی کتاب (جامع صغیر) میں غالب کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو بیان نہیں کیا (کہ عموماً نصف صاع گندم اور آٹے کی قیمت برابر ہوتی ہے صرف پسائی کا معمولی سا فرق ہوتا ہے . بہر حال بازار کے لحاظ سے گندم اور آٹے کی قیمتوں کا پتا کرکے صدقۂ فطر ادا کیا جا سکتا ہے) .

صدقۂ فطر میں اگر روٹی دی جائے تو اس کا اعتبار قیمۃ سے ہوگا یہی صحیح موقف ہے . نصف صاع کا اعتبار امام اعظمؒ کے

نزدیک وزن سے ہوگا اور امام محمدؒ کے نزدیک ناپ سے ہوگا۔

صدقۂ فطر میں احناف کے نزدیک آٹا گندم سے بہتر ہے اور نقدی آٹے سے افضل ہے۔ یہ رائے امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے اور اسی رائے کو فقیہ ابو جعفرؒ نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ طریق حاجۃ اور ضرورۃ کو زیادہ مناسب اور جلد پورا کرنے والا ہے۔

ابوبکر الاعمش سے مروی ہے کہ گندم سب سے عمدہ ہے۔ کیونکہ گندم کا ادا کرنا ائمہ کے اختلاف سے بالا تر ہے اس لیے کہ آٹے اور قیمت کی ادائیگی میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔

صاع کی مقدار

امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صاع کی مقدار آٹھ عراقی پونڈ کے برابر ہے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ صاع کی مقدار ۵⅓ پونڈ کے مساوی ہے اور یہی امام شافعیؒ کا قول ہے۔ ان کی دلیل نبی کریم ﷺ کی یہ دلیل ہے کہ ہمارا صاع دوسرے صاعوں سے چھوٹا ہے (اور سب سے چھوٹا صاع ۵⅓ پونڈ ہی ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے صاع کے متعلق یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ ایک مد سے وضو فرماتے جو دو پونڈ کے مساوی ہوتا تھا اور آپ ایک صاع پانی سے غسل فرماتے رہے جو آٹھ پونڈ کے برابر تھا۔

حضرت عمرؓ کا پیمانہ بھی یہی تھا (اور جہاں تک امام شافعیؒ کی دلیل کا تعلق ہے اس کا جواب احناف یہ دیتے ہیں) . کہ نبی کریم ﷺ جو صاع استعمال فرماتے تھے وہ ہاشمی صاع سے چھوٹا تھا اور عرب لوگ ان دونوں میں ہاشمی صاع کا استعمال کیا کرتے تھے .

صدقۂ فطر کے واجب ہونے کا وقت

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ صدقۂ فطر عیدالفطر کے روز طلوع فجر کے ساتھ ساتھ صاحب نصاب شخص پر واجب ہو جائے گا .

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رمضان المبارک کے آخری روز سورج غروب ہونے پر صدقۂ فطر واجب ہو جائے گا . حتی کہ اگر کوئی شخص اسلام لائے یا اس رات پیدا ہو تو ہمارے نزدیک اس پر صدقۂ فطر واجب ہوگا اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں .

اور اس کے برعکس صورۃ میں بھی یہی اختلاف ہے ، مثلاً اگر صاحب کے غلاموں یا اس کی اولاد میں سے کوئی فوت ہوگیا . (یعنی شب عید کو فوت ہوگیا تو ہمارے نزدیک اس پر صدقۂ فطر واجب نہیں ہوگا اور امام شافعیؒ کے نزدیک واجب ہوگا) . ان کی دلیل یہ ہے کہ صدقۂ فطر کے ساتھ خاص ہے روز فطر کا وقت شب عید کو سرِ شام شروع ہو جاتا ہے .

ہماری دلیل یہ ہے کہ صدقۂ فطر میں اضافۃ اس فطر کے ساتھ خاص کرنے کے لیے ہے اور یہ اختصاص یوم فطر سے ہے . نہ کہ شب فطر سے .

مسئلہ : مستحب یہ ہے کہ صدقۂ فطر عید کے دن عیدگاہ میں جانے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے. کیونکہ نبی اکرم ﷺ عید گاہ جانے سے پہلے پہلے ادا فرما دیا کرتے تھے . اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ صدقۂ فطر کی ادائیگی کا مقصود ناداروں کو مستغنی کرنا ہے تا کہ غریب اور فقیر نماز سے توجہ ہٹا کر مانگنے میں مشغول نہ رہیں اور یہ اسی صورۃ میں ممکن ہے جب صدقۂ فطر پیشگی ادا کر دیا جائے .

اگر لوگ صدقۂ فطر عید سے پہلے ادا کر دیں تو جائز ہوگا . کیونکہ انہوں نے سبب کے ثابت ہونے کے بعد یہ ادائیگی کی ہے. لہذا یہ زکاۃ کے پیشگی ادا کرنے کے مانند ہے . پیشگی ادا کرنے میں مدۃ میں کوئی اختلاف نہیں اور یہی صحیح ہے .

(بعض فقہاء نے کہا کہ اس کو رمضان المبارک کے آخر میں پیشگی ادا کرنا جائز ہے اس سے پہلے نہیں . بعض کے نزدیک اسے آخری عشرے میں ادا کرنا چاہیے) .

مسئلہ : اگر کچھ لوگ عید کے دن کے بعد تک اسے مؤخر کریں تو یہ ساقط نہیں ہوگا بلکہ ان پر اس کا ادا کرنا واجب ہوگا . کیونکہ اس میں عبادۃ کا پہلو معقول ہے . لہذا ادائیگی کے وقت کا آخری انداز کرنا جائز نہیں . بخلاف قربانی کے (کیونکہ قربانی میں تین دن گزرنے کے بعد قربانی کا وقت نہیں رہتا) .